فلک تنویر

صنم تراش

مکمل ناول

digest Novels Lovers group ❤️❤️

آئینے کے سامنے کھڑا وہ اپنے چہرے کو تک رہا تھا۔ ہلکی بڑھی ڈاڑھی، جس کی دو ہفتے پہلے حجامت کی تھی...... یاسیت بھری آنکھیں اور ان آنکھوں تلے گھیرے حلقے...... اس کی آنکھوں میں رت جگوں کی سرخ ڈوریاں رقصاں تھیں۔ کوئی بھی اس کا یہ حالیہ حلیہ دیکھ پہچان نہ پاتا کہ وہ زرک خان تھا۔ وہ تو کوئی لٹا پٹا جوگی تھا...... جس کا کیسری لباس کئی میل سفر کی دھول سے اپنا رنگ بدل چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کشکول نہ تھا کیونکہ وہ کشکول تو وہ اسی کے در پر توڑ آیا تھا، جس کے سامنے اس نے اپنا کشکول پھیلایا تھا۔

"آج کے بعد نہ میرا تم سے کوئی تعلق ہے اور نہ میرے خاندان میں سے کسی کا...... اگر کسی نے تم سے رابطہ کیا یا بات کی تو اس سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں......"

اس کے کانوں میں کسی ہتھوڑے کی طرح ضرب مارتی آوازیں گونج رہی تھیں اس نے گہری سانس بھر کر، تھوک نگلا اور گیلے بال ٹھیک کرتے ہوئے وہ پشاوری چپل پہن کر باہر نکلنے لگا۔ کمرے سے باہر نکل کر ایک طویل راہداری تھی، جس میں خاموشی اور ٹھنڈ بیک وقت محو استراحت تھی۔ راہداری کے پکے فرش پر ہلکی سی دھول جمی تھی، راہداری کے پار ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا اور سرخ اینٹوں سے بنا صحن ...... چار دیواری کے قریب کیاریوں میں پھول تھے اور امرود اور انار کے درخت ...... جو بچے کبھی کبھی کھلے دروازہ کو دیکھ کر سارا خالی کر دیتے ......

جب وہ گھر کو باہر سے تالا لگا کر نکل رہا تھا تو حسب معمول گلی میں انار کے درخت کی لٹکتی شاخوں میں اناروں کو بچے ڈنڈے سے مار گرانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اس کو دیکھ بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ لحظے بھر کے لیے ہنسا تھا۔

اس کو قاسم کی عیادت کرنے جانا تھا۔ قاسم اس کی بڑی خالہ کا نواسا تھا۔ جب وہ یہاں منتقل ہوا تھا، تو اتمان زئی میں قاسم ہی تھا، جو اس کے برے وقت میں اس کے ساتھ تھا۔ کچھ دنوں سے وہ اپنے نئے مجسمے کی تیاری میں مگن تھا جب دو ہفتوں سے قاسم نہیں آیا تو پوچھنے پر اس کو پتا چلا کہ وہ بیمار ہے۔

"ایسا بیمار ہے کہ ڈاکٹروں کو بھی اس کی بیماری کا پتا نہیں چل رہا...... شیر پاؤ، ایل آر ایچ کی چکریں تک کاٹیں ...... لیکن بیماری اس کی جان نہیں چھوڑ رہی......لوگ تو کہہ رہے ہیں کہ جادو ٹونا ہوا ہے۔ اس کی پھوپھیاں ہیں بھی بنگالیوں جیسی...... ایسی کالی کالی صورتیں ...... استغفار ...... سنا ہے وہ بابا گانوں (باباؤں) کی جھونپڑیوں میں جایا کرتی ہیں۔ اس صیاد درزی نے تو اس کو ننگے ہاتھوں پرانے قبرستان میں تعویذ دفن کرتے دیکھا تھا۔" اس کو بتانے والا قاسم کا والی بال کا دوست تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

"اللہ شفا دے۔" کہہ کر وہ گھر چلا آیا تھا۔

ابھی سہ پہر کی دھوپ سمٹ کر چبوتروں اور منڈیروں پر سرک رہی تھی۔ وہ جب رخسانہ آپا کے گھر کے دروازے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ان کے گھر کے میں پڑوس کی عورتوں کا جمگھٹا تھا۔ وہ واپس پلٹنے ہی لگا تھا جب اس کو رخسانہ (قاسم کی ماں) نے دیکھ لیا۔ وہ فوراً اس کے پاس آئیں۔

اس نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ رخسانہ آپا اس کی ماں کی عمر کی تھیں،

توان کے درمیان خالہ زاد والا رشتہ نہ تھا۔ وہ اس کو قاسم جیسا ہی سمجھتی تھیں۔

''رازہ (آؤ!)'' وہ اس کو کمرے لے گئیں۔

صحن میں عورتیں کھڑی چارپائی پر لیٹے قاسم کو دیکھ رہی تھیں اور کچھ نے پلٹ کر اس کو دیکھا۔ اس نے پل بھر کو قاسم کے سرہانے' کچی زمین پر بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا' جس نے گھٹنوں میں سر دیا ہوا تھا اس کے سر پر سیاہ دوپٹا تھا' مہندی رچے پیر مٹی سے اٹے تھے......

''میں شربت لے کر آتی ہوں۔'' رخسانہ آپا اس کو کمرے میں بٹھا کر باہر چلی گئیں۔

کمرا کچا تھا اور تنگ بھی۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور کچے دیواروں پر سفید چونا تھا۔ پرچھتی پر نفاست سے رکھے برتن اور اس کے عین اوپر بڑے سے فریم میں رخسانہ آپا کے مرحوم شوہر کی تصویر۔ اس نے کھلی کھڑکی سے دیکھا تو اس لڑکی کا رخ اب اس کے

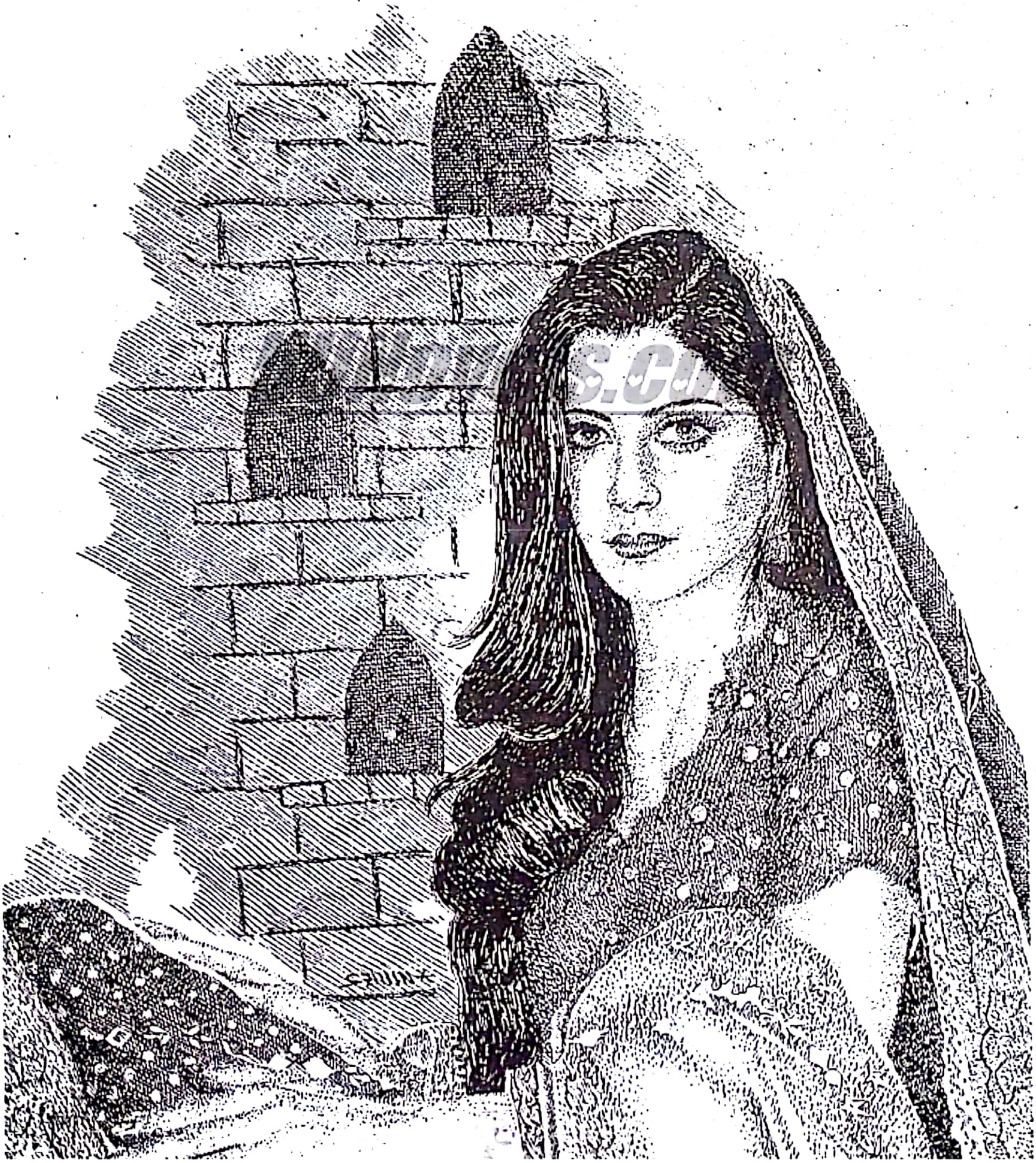

سامنے تھا۔ وہ تحیر بھری نظروں سے باہر ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کس لیے جمع تھے اور صحن میں قاسم کی چارپائی کیوں پڑی تھی؟۔ سوالات کافی تھے لیکن اس کے جواب اگر خود کوئی دیتا تو ٹھیک وگرنہ اس نے جوابات جاننے کی کوشش نہیں کرنا تھی۔

''یہ لو۔'' آپا اس کو شربت کا جام دے کر اس کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہرے پر تھکان کے آثار تھے۔ باہر بیٹے کی چارپائی کو دیکھتے ہوئے' ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ نے لگے اور جب بولیں تو ان کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

''یہ دو ہفتے ایسے گزرے جیسے قیامت۔ نہ دن کی خبر' نہ رات کی۔ جانے کون سی بیماری میرے ہنستے مسکراتے ضوان (جوان) بیٹے کو چمٹ گئی کسی جن کی طرح۔ لوگوں نے کہا کہ جادو ہے تو پیروں کی درگاہوں پر بیٹھی رہی...... پھر لوگوں نے کہا کہ بیماری ہے تو اسپتالوں کے چکر کاٹے......''

''آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں' آپا۔'' وہ بھیگے لہجے میں بولتی آپا' کو بیچ میں نرمی بھرے شکوہ کناں لہجے میں بولا۔ آپا نے سر جھٹک کر اس کو دیکھا اور ہلکا سا مسکرائیں۔

''تم پہلے ہی کافی تکلیف سہہ رہے ہو' بچیا (بچے)......''

ان کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ بہت خوددار عورت تھیں۔

تم سوچ رہے ہو کہ یہ خواتین کیوں جمع ہیں؟'' اس کی سوالیہ نظروں میں چھپے سوال کو سمجھ کر انہوں نے پوچھا تھا۔'' دراصل...... وہ پرانے مسجد کے مولانا صیب نے کہا تھا...... کہ......''

ان کا سر جھک گیا...... وہ شرم تھی' پچھتاوا تھا' یا پھر جھجک...... وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان کے اگلے جملے نے اس کا سانس تک کھینچ لیا۔ وہ یک ٹک آپا کا چہرہ دیکھے گیا۔

''......کہ اگر کوئی اپنی زندگی دان کر دے تو وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ بس چارپائی کے گرد' اگر وہ تین چکر کاٹے تو بیمار کی ساری بیماری اس کو لگ جائے گی......ایسا کئی بار ہوا ہے اور بہت کارگر بھی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ باچا خان (مشہور سیاست دان) کی بیگم نے بھی باچا خان کے لیے اپنی زندگی قربان کی تھی (باچا کی سوانح عمری سے ماخوذ)۔ ان کے گرد چکر کاٹ کر وہ بیمار ہو بیٹھیں اور باچا خان جک جوڑ (صحت یاب)......''

زرک کی نظریں فوراً کھڑکی کے پار گئیں۔ جہاں وہ لڑکی ہنوز اسی انداز میں بیٹھی تھی...... گھٹنوں میں سر دیے...... وہ اپنے بھائی کے سرہانے' وہ اپنی زندگی قربان کرنے بیٹھی تھی۔ کیسی روایت تھی یہ' کیسی جہالت...... اس نے گردن گھما کر' پہلو میں بیٹھی آپا کے چہرے پر پچھتاوا دیکھا لیکن ان کی آنکھوں میں ٹھہرے اس لڑکی کے عکس پر' چارپائی میں بیمار لیٹے بیٹے کا دکھ بھاری تھا۔

اس نے کہنا چاہا کہ یہ کیسی جہالت ہے؟ لیکن کمرے میں اندر داخل ہوتے آپا کے دیور اور ان کے بیٹوں کو دیکھ کر آپا فوراً اٹھیں...... باہر صحن میں عورتوں نے راستہ دیا' گھٹنوں میں سر دیے اس سیاہ دوپٹے والی لڑکی' نے سر اٹھا کر دیکھا...... تو اس کی آنکھیں کسی بھی احساس سے عاری تھیں۔ بالکل خالی' کھوکھلی' ویراں آنکھیں۔

کچھ عورتوں نے پلو منہ پر رکھے تھے اور کچھ ایک دوسرے کے کانوں میں کھسی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اس آپا نے جھک کر لڑکی کے کان میں کچھ کہا تھا۔ اس نے اٹھ کر سر پر دوپٹا ٹھیک کیا اور سر جھکا کر چارپائی کے گرد چکر کاٹنے لگی۔

زرک کے سینے میں درد اٹھنے لگا' یہ کیا جہالت تھی...... کون سا علاج تھا...... سراسر بدعت...... پاس کھڑے لوگ تماش بین تھے اور تسبیح پڑھتے قاسم کے تایا اور ان کے بیٹے بھی...... وہ فوراً اٹھا اور جلدی سے باہر جانے لگا۔ آپا اس کو جاتا دیکھ کر رکیں اور اس کے پاس آئیں۔

''رک جاؤ زرک۔ چائے چڑھا دی ہے

......رات کا کھانا......"

"نہیں آپا۔ بس میں چلتا ہوں۔" اس نے جلدی سے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

معاً وہ لڑکی ٹھوکر کھا کر گری۔ اس نے مڑ کر دیکھا' تو وہ بیٹھ کر کراہتی اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو گھور رہی تھی۔ نظروں کی حدت پا کر اس نے سر اٹھا کر زرک کو دیکھا اور دونوں کی نظریں ملیں۔

زرک غلط تھا' اس کی آنکھیں احساسات سے عاری قطعاً نہیں تھیں......وہاں تو درد کا ایک بیکراں سمندر بہہ رہا تھا۔ زرک کو اس لڑکی کی آنکھوں سے خوف آیا اور فوراً سے بیشتر وہ پلٹا تھا، وہ وہاں ایک پل نہیں رہنا چاہ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں وہی بازگشت گونج رہی تھی......

"میرا اس سے کوئی تعلق نہیں......"

☆☆☆

ساری رات وہ اسٹوڈیو میں بیٹھا رہا۔ اس کا مجسمہ' جس کے چہرے کے خدوخال میں اس نے محض آنکھیں بنائی تھیں۔ clay (گارا) سے بنے اس مجسمے کی خالی آنکھیں' اس کو گھورتی رہیں اور اس کے کانوں میں بہت ساری آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ کئی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اسے گھٹن سی محسوس ہوئی تو اس نے کھڑکیاں کھولیں اور لیٹ گیا۔ کھلی کھڑکی سے چاند جھانکتا رہا اور اس کی آنکھوں میں بے خوابی کھیلتی رہی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ لگی تھی۔ جب وہ اٹھا تو دیوار گیر گھڑی میں دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ وہ اٹھا اور باورچی خانے میں اپنے لیے چائے بنانے لگا۔ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک دینے والے ہاتھ عجلت پسند معلوم ہوتے تھے۔ وہ تیزی سے دروازہ کھولنے نکلا۔ دروازہ کھولا تو سامنے آپا' سفید برقع پہنے کھڑی تھیں۔

"السلام علیکم آپا......آیئے۔" اس آپا کو راستہ دیا۔

آپا اندر داخل ہوئیں' تو انہوں نے سر سے برقع اتارا اور گہری سانس لی۔

"اللہ بخشے برکت ماماجی (ماموں) کو۔ ساری زندگی بے اولادگی کے طعنے سنتے رہے اور آخر میں پورے خاندان کے سامنے کہہ دیا تھا تمہارے کہ میرا تعلق تو رہے گا اس کے ساتھ' میرا بیٹا ہے' آج سے یہ۔ مرنے سے پہلے وہ بے اولاد نہ تھے۔ دیکھو گھر کتنا سونا سونا لگ رہا ہے۔ وہ ہوتے تو سارا دن ان کا ریڈیو ٹیپ بجتا رہتا۔" آپا اندر برآمدے میں بچھائی گئیں چارپائیوں پر بیٹھ گئیں۔ وہ خاموشی سے ان کو سنتا رہا۔

"آپا! چائے پئیں گی؟"

"ہاں' لیکن دودھ مت ڈالنا' تورے چے (بغیر دودھ کے کالی چائے) لانا' گلا خراب ہو چکا ہے......ساری رات خوشی کے آنسو روتی رہی ہوں۔" بتانے لگیں۔

اس کے قدم وہیں تھمے تھے۔ "قاسم ٹھیک ہو گیا؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

"تم چائے لاؤ' بتاتی ہوں سب کچھ۔" آپا مسکرائیں تو ان کی مسکراہٹ میں ان کی کافی دنوں کی تکان پنہاں تھی۔

وہ سر ہلاتا ہوا باورچی خانے چلا گیا۔ اس کی سوچوں کا محور' کچی زمین پر ننگے پیر بیٹھی اس لڑکی کے گرد گھومنے لگا۔ جس نے آپا کی فرسودہ سوچ کے زیر اثر اپنی زندگی قربان کر دی تھی۔ قاسم کی صحت یابی کے پیچھے یقیناً کوئی اور بات تھی۔ وہ اس جاہلانہ بات پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

جب وہ چائے بنا کر لایا تو آپا ویسے ہی بیٹھے ہوئے کیاری میں لگے امرودوں کو دیکھ رہی تھیں۔ "برکت ماماجی نے دو چیزوں سے بہت پیار کیا......ایک ان کیاری میں لگے درختوں سے اور ایک اپنے ریڈیو ٹیپ کو......ہائے اس گھر کی اینٹ اینٹ سے ماماجی کی یادیں ٹپکتی ہیں۔" چائے کی پیالی تھام کر آپا پرانے وقت کی یاد میں کھو سی گئی تھیں۔

digest Novels Lovers group

کچھ دیر تک، وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ آپا جب چائے پی چکیں‘ تو اس کی اور رخ کر کے کہنے لگیں۔

"تم نے پوچھا نہیں‘ میں کیوں آئی ہوں؟"

"میں یہ کیوں پوچھوں گا آپا...... آپ جب بھی آئیں‘ مجھے کوئی مسئلہ تھوڑی ہوگا آپ کے آنے سے......" اس نے نرمی سے کہا۔

"وائی زارا!" توقف کے بعد آپا گویا ہوئیں۔ "دراصل میرے آنے کا ایک بڑا مقصد ہے۔ سر سے واری گئی لڑکی کی کوئی وقعت نہیں رہتی‘ اس کا ہاتھ کسی کو بھی دے آؤ...... ملنگ‘ بدمعاش‘ غریب‘ لیونئے (پاگل)...... کیونکہ اس کے لیے کوئی اچھا رشتہ نہیں آنے والا ہوتا......" آپا تول تول‘ بول رہی تھیں۔ اور وہ جو بے دھیانی میں سن رہا تھا۔ ایک دم اس نے سر اٹھا کر آپا کی نظروں میں دیکھا اور اگلے ہی پل وہ ان کی بات کی تہہ تک جا پہنچا تھا۔

"نہیں...... نن...... نہیں آپا......" اس نے آپا کو ٹوکنا چاہا لیکن وہ ویسے ہی بولے جا رہی تھیں۔

"میری زرمینے کے لیے کوئی اچھا رشتہ نہیں لائے گا۔ یا تو گھر پر پڑی رہے گی یا پھر......" رک کر اس کے نفی میں ہلتے سر کو دیکھ کر انہوں نے کہا۔ "تم اس سے شادی کر لو بیٹے۔ ویسے تمہارے نام پر......"

"آپا...... اللہ کے لیے...... بس کر جائیں......" اس کی کنپٹی کی رگوں میں خون ابلنے لگا ایسا لگنے لگا کہ جیسے اس کی رگیں پھٹ جائیں گی۔

"...... تمہارے نام پر بیٹھی رہے گی۔ یہ گھر‘ جو ویراں پڑا ہے۔ اس کو سنوار دے گی۔ تمہاری خدمتیں کرے گی۔ میں تم سے اس کے ساتھ بیوی کے ساتھ رشتے کا تقاضا بھی نہیں کر رہی ہوں...... بس اس کو اپنے نام کر لو......"

"آپا! میں...... شادی......" اس کی سانسیں بے ربط ہونے لگیں‘ اس نے اٹھ کر پانی پینا چاہا لیکن اس سے اٹھا نہیں گیا۔ اس کی دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگی تھیں۔ لیکن آپا اپنی بھیگی آنکھوں کے پار اس کی حالت نہیں دیکھ پا رہی تھیں۔

وہ جس کے آگے ہاتھ پھیلا رہی تھیں‘ جس سے بھیک مانگ رہی تھیں...... وہ تو خود دھتکارا گیا تھا...... اس کے در سے‘ جس کے در پر وہ فقیر بن کر گیا تھا اور بے مراد لوٹا تھا۔ وہ جس کا خیال کسی سوئی کی طرح‘ اس دل میں چبھ کر اس کا دل زخمی کر دیتا تھا۔ وہ جس کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتی ہیں اور اس کی صورت آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی...... وہ...... جس کو آپا جانتی تھیں...... آپا سب جانتے ہوئے بھی کہہ رہی تھیں۔

"دیکھو، اس جھریوں سے بھرے میرے بوڑھے ہاتھوں کو...... تمہارے سامنے پھیلا رہی ہوں۔ وہ...... وہ گلاب خان (زرمینہ و قاسم کا تایازاد) اس کو نکاح میں لینا چاہتا ہے۔ تم جانتے ہو نا‘ کتنا ظالم ہے وہ۔ اس کی پہلی بیوی سے اس کی کوئی اولاد نہیں۔ وہ اولاد کے لیے نہیں...... میری کلی کو مسلنے کے لیے یہ نکاح کرنا چاہتا ہے۔" آپا اب زار و قطار رو رہی تھیں۔

اس نے گہری سانسیں لیں اور ان کے جڑے ہاتھ تھام کر نرمی سے نیچے کیے۔

"آپا! میں نہیں کر سکتا شادی...... اس جاہلانہ سوچ کی وجہ سے نہیں...... بس میں "کسی سے بھی" شادی نہیں کرنا چاہتا۔" زرک نے نرم لہجے میں کہا اور اٹھ کر اندر کمرے میں آ گیا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں آیا‘ ایک بار پھر سے اس کی حالت بگڑنے لگی۔ اس نے پانی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں‘ اس کے گلے میں کانٹے اگ آئے تھے۔

"میرا اس سے کوئی تعلق نہیں...... کوئی بھی اس سے تعلق نہیں رکھے گا۔" وہی اس کا پیچھا کرتی آوازیں۔

"تم اس کو نہیں چھوڑ سکتے...... تو مجھے چھوڑ دو...... میں تمہیں چھوڑ رہی ہوں...... میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔" کسی بریخنہ کی طرح‘ اس کے کانوں میں یہ دو آوازیں گونجتی رہیں......

☆☆☆

اس کی طبیعت فی الحال سنبھل گئی تھی۔ سارا دن وہ اسٹوڈیو میں بیٹھا اپنا کام کرتا رہتا۔ سارے میں تازہ گارے کی' اور ربڑ کی خوشبو چکراتی رہتی اور اس کے ہاتھ گارے سے اٹے رہتے۔ وہ گھنٹوں لگا رہتا اور اپنے تازہ مجسمے کے چہرے کے خدوخال بناتا رہتا ......اس کے سامنے رکھے کینوس پر کوئی ریفرنس تصویر بھی نہیں تھی۔ شاید وہ جس کا مجسمہ بنا رہا تھا' اس کے چہرے کو وہ کبھی بھولا ہی نہیں تھا......

اس کو یہاں' اسمان زئی چارسدہ آئے چھ ماہ' ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس چھ ماہ میں کسی نے بھی اس سے رابطہ نہیں کیا۔ مور جانے' عباس لالہ' نبیل' طلعت جہاں' جمیلہ کسی نے بھی نہیں ...... لاشعوری طور پر نہیں' وہ اپنے پورے شعور میں ان میں سے کسی کے ملنے کے انتظار میں تھا۔ برکت ماما اس کو ساری رات گلے لگا کر کہتے تھے۔

"ایک دن سب کا خون جوش مارے گا اور ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ وہ تم سے ملنے ضرور آئیں گے۔"

وہ غلط تھے۔ کسی کے خون نے بھی جوش نہیں مارا' شاید ان کی رگوں میں خون برف ہو چکا تھا۔ پھر جب ماموں کو خود بھی لگنے لگتا کہ وہ غلط ہیں' تو وہ اس سے یہی جملہ کہتے لیکن آخر میں' لیکن اگر' لگا کر مزید اضافہ کرتے۔

"لیکن اگر تم خود چاہو تو یہ سب چھوڑ دو جاؤ......ان کے پاس۔"

اس کو مزید تکلیف ہونے لگتی۔ ماموں پھر سے اس کو سمجھانے لگتے ۔ جب تھک ہار جاتے تو "سردار علی ٹکر" کے ٹیپ شدہ غزلیں لگا کر باہر صحن میں چارپائی کھینچ کر' چادر ناک تک کھینچ کر سو جاتے۔ ساری رات سردار علی ٹکر کی آواز گونجتیں اور وہ خاموشی سے ایک ہی جگہ بیٹھا رہتا۔

زندہ دل قاسم' زندگی اور موت کے دوراہے پر جنگ لڑ کر واپس آ چکا تھا۔ اس کی زندگی میں اس کے صرف دو اپنے تھے۔ زرینہ اور رخسانہ آپا۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگیوں پر اس کی زندگی کو فوقیت دی ......بدعت کر کے' گناہ کر کے......وہ اب قاسم اور اپنا موازنہ کر رہا تھا۔ اس کو پیار کرنے والوں نے جانے نہیں دیا تھا' کس کر پکڑے رکھا......اور اس کو ......دھتکار ملی ......ایک اس انسان سے......جس سے اس نے سب سے بڑھ کر محبت کی......نغمہ۔ اور ایک اس انسان سے......جس کی محبت کے لیے وہ ہمیشہ ترستا رہا......اس کا باپ۔

اس کو آپا کی منت وزاری یاد آئی اور پھر اپنی دھتکار......آپا کے بندھے ہاتھ اور پھر بارش میں بھیگتا اس کو اپنا وجود یاد آیا......پھر اس نے خود کو اور زرینہ کو ایک ہی ترازو میں تولا......اور دھتکار کے وزن میں اس کا وجود بھاری نکلا۔ کیا وہ اپنی بدقسمتی کی سیاہی سے زرینہ کے ماتھے کو سیاہ کرنے کی جسارت کر رکھ سکتا تھا؟

اس کے جواب میں انکار واضح تھا۔ مزید کام کرنے سے اس کا دل اچاٹ ہوا اور وہ اٹھا۔ اور وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ اس کو قاسم کی عیادت کرنے جانا تھا۔

☆☆☆

ستمبر کی دوپہروں میں اب حدت نہ تھی۔ نہ ہی بلاوجہ پسینے کے پسینے آتے تھے۔ زرک ۔ نے ہلکے بھورے رنگ کا کاٹن زیب تن کیا تھا۔ اس کے اجلے سفید چہرے میں ہلکی پیلاہٹ کا شائبہ تھا۔ آنکھوں تلے حلقے اور ان میں بے خوابی کی سرخ ڈوریوں کی مستقل حراجی تنا حال قائم تھی۔

آپا کے گھر کے سامنے بہتا نالا اور اس پر بنایا گیا چھوٹا پل پار کر کے جب وہ ان کے گھر داخل ہوا تو اتفاق سے آج پھر سے ان کے گھر میں بھیڑ تھی لیکن اس بھیڑ میں عورتوں کی تعداد کم تھی۔ کچے بر آمدے میں آپا اپنے سفید دوپٹے کا پلو منہ پر رکھے بہت کرب و برداشت سے' قاسم کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ ان کے دوسرے ہاتھ میں ہاتھ والا پنکھا'

Urdunovels.com

جس کو جھلاتے وہ قاسم کو ہوا دے رہی تھیں۔ سامنے ان کے دیور دیورانی اور ان کے بیٹے۔

"السلام علیکم!" وہ کھنکار کر آگے بڑھا اور سلام کیا' سب کی گردنیں پیچھے اور رخسانہ آپا کی اس پر نظر پڑتے ہی آنکھوں میں روشنی کے دیپ جلنے لگے۔ یوں جیسے مشکل گھڑی میں اچانک کوئی اپنا مدد کرنے آئے تو آنکھیں جھلملا اٹھتی ہیں۔

"وعلیکم السلام! رازہ ضوانہ (آؤ جوان)!" قاسم کے تایا کفایت کے ماتھے پر ابروؤں کے بیچ الف بن گیا تھا لیکن یہ اس کو دیکھ کر نہیں تھا..... ان کی کرختگی کے سبب تھا۔

وہ سب سے مل کر پھر قاسم کے گلے لگ کر بیٹھ گیا اور اس کا حال احوال پوچھنے لگا۔

" زرمینے !زرک آیا ہے ..... شربت لاؤ تیمو (لیموں) ڈال کر ....." آپا نے زرمین کو آواز دے کر کہا۔

"بھئی تو پھر کیا سوچا تم نے رخسانے؟" قاسم کی تائی نے پوچھا۔ "اب تو الحمدللہ قاسم بھی صحت یاب ہو چکا ہے۔ بس تم بتاؤ' اپنا دیکھا بھالا ہے گلاب خان....." انہوں پاس بیٹھے گلاب خان کو یکھا۔ جس کے ہونٹ چرس پی پی کر انتہائی کالے ہو چکے تھے۔ "الحمدللہ موزنگز ارہ (نماز پڑھنے والا) ..... تبلیغی ..... نظر کی حفاظت کرنے والا ..... ایسا داماد کبھی نہیں ملے گا تمہیں رخسانے اور اس حالت میں تو کبھی بھی نہیں' کہ جب تم نے اس کو اپنے بیٹے کے سر وار دیا ہے۔ اور رہی بات اس کی شادی کی ..... تو بھئی' دوسری شادی میں کیا حرج ہے۔ الٹا سے اس کی کوئی اولاد ہے ہی نہیں' اس سے ہوگی تو رانی بنا کر رکھے گا۔"

امیر جانہ بی بی گلاب خان کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

آپا نے مڑ کر دیکھا۔ "دیکھا بھالا" کو ایک بار پھر سے دیکھ کر ان کو الفت کی مار کٹائی نظر آئی۔ ایک بار بھوسے کے لیے بھوج (جس میں بھوسہ بھرا جاتا) خراب سینے پر گلاب خان نے بھوج سینے والی سوئی الفت کے ہاتھ میں گھونپ کر اور پھر بالوں سے پکڑ کر کنوئیں میں لٹکایا تھا...... بے چاری کی چیخوں سے سارا محلہ ہل چکا تھا۔

وہ خاموشی سے نچلا لب کاٹتی رہیں......

"بھئی بڑا بیٹا باپ جیسا ہوتا ہے۔ قاسمہ بچے! تم ہی بولو۔ تمہیں یہ رشتہ ....." تائی اب قاسم سے پوچھ رہی تھیں۔ ان کو قاسم کے ہاں کرنے کا پورا یقین تھا۔ ایسے میں زرمینہ آنے ہی لگی تھی کہ ماں کے جملے نے اس کے قدم روک لیے۔

"نہیں ....." آپا فوراً سے پیشتر بولیں۔ "نہیں امیر خورے! ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں پہلے ہی اپنے خالہ زاد ....." زرک کی اور مدد مانگتی نظروں سے دیکھا۔ "کو زرمینہ کا ہاتھ دے چکی ہوں۔ زرک زرمینہ سے نکاح کرنے والا ہے۔ بس ایک چھوٹی سی دعوت اور سادگی سے رخصتی۔"

"وائی اللہ تو یہ اتنا سفید جھوٹ۔ وہ بھی منہ پر ہی بول رہی ہو ہمارے رخسانے۔ کیسا رشتہ' بھئی' کون سا رشتہ؟ یہ کیا آنا فاناً رشتہ طے کر دیا کہ کانوں کان خبر ہی نہ ہونے دی۔"......

امیر جانہ بی بی کی باریک لیکن تیز آواز میں غصہ کی وجہ سے لرزہ تھا۔ پھر انہوں نے زرک کو دیکھا اور ان کے ماتھے پر طنزیہ شکنیں ابھریں۔ "اور رشتہ دیا بھی کسے۔ اس دھتکارے گئے لڑکے کو.....! جس سے اس کا باپ' پورا خاندان لاتعلق ہو چکا ہے۔"......

"دیکھو خورے! اب آپ حد کر رہی ہیں۔ میرے داماد کو میرے ہی گھر میں ....." رخسانہ کو غصہ آیا لیکن ان کی آواز میں ابھی تک سامنے بیٹھے دیور کا خوف تھا

"ارے بس بس۔ بڑا آیا داماد۔ اوگورہ سڑیا (دیکھو جی)۔" سپاٹ چہرہ لیے خاموش بیٹھے شوہر کو دیکھ کر انہوں نے کہا تھا۔ "آپ کو مشر (بزرگ) مانتے ہی نہیں ورنہ رشتہ کرتے وقت تو آپ سے مشورہ کرتے ناں! انہیں بھئی دیدوں

میں حیا کا پانی ہی سوکھ گیا ہے اس پورے خاندان کا۔"

"بڑا بیٹا باپ جیسا ہوتا ہے خورے اور جب قاسم زندہ ہے تو فیصلہ بھی یہی لے گا۔" رخسانہ کے لہجے میں اس بار تھوڑی گرج تھی۔

امیر جانہ اور کچھ بولنے ہی والی تھیں کہ تیز گمبھیر آواز میں تایا نے انہیں ٹوکا تھا "بس چپ شہ۔ کہہ دیا نا صاف لہجے میں کہ یہ بی بی ہمیں کچھ نہیں سمجھتیں تو بات ختم۔ ان سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں رہے گا اب سے۔ اٹھو۔" یہ کہہ کر تایا اٹھے اور ان کے پیچھے ان کے اہل وعیال...... رخسانہ آپا اپنی جگہ بیٹھی رہیں۔ جیسے ہی وہ چلے گئے' وہ زرک کی طرف مڑیں۔

"مجھے معاف کر دینا بچے! تمہارے کندھے پر بندوق رکھ کر اپنی جنگ لڑی۔"

"بندوق اپنے کندھے پر رکھو یا دوسروں کے' معنی نہیں رکھتا۔ جنگ لڑنا معنی رکھتا ہے آپا......" اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ "مجھے یہ رشتہ قبول ہے لیکن......" توقف کیا۔ "لیکن یہ رشتہ محض نکاح کے دو بول تک محدود رہے گا بس۔ آپ کی عزت کی خاطر۔"

اس نے خود کو کہتے سنا تھا۔

☆☆☆

بیٹھک میں محلے دار اور قاسم کے پھپھو کے بیٹے اس کے نکاح میں شرکت کرنے کے لیے موجود تھے۔ اس نے حسب معمول سفید کاٹن کا شلوار قمیص پہنا تھا اور اس کے اوپر سیاہ واسکٹ۔ زرک کی دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل تھیں لیکن اس کا چہرہ اس کے اندرونی کیفیات کی غمازی میں ناکام تھا۔ وہ خاموش بیٹھا تھا۔ اس سے زرینہ ولد نجم خان کو نکاح میں قبول کرنے کے لیے پوچھا جا رہا تھا...... لیکن اس کے دماغ میں کافی شور تھا۔ کئی الفاظ' کئی جملے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ کسی نے اس کے بازو کو پکڑ کر جھنجوڑا تھا۔

"بیٹے...... مولانا صیب کچھ پوچھ رہے ہیں۔"

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سب اس کی غائب دماغی پر اس کو حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی سانسیں چڑھنے لگیں۔ لیکن اس نے مٹھیاں بھینچیں اور اس نے پھر اس شور میں اپنی آواز سنی تھی۔

"مجھے قبول ہے۔"

☆☆☆

بارش کی گرج کھڑکیوں کے پٹ میں چھوٹے شیشوں پر پڑتیں اور آدھے ادھورے ہیولے اندر نگیں فرش پر بن کرتے۔ کمرے میں اس کے وجود کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ بناری جوڑے میں ملبوس لڑکی چارپائی پر بیٹھی اپنے پیروں کی حنا کو دیکھ رہی تھی۔

وہ لاشعوری طور پر اس شخص کا انتظار کر رہی تھی' جس کے نام پر وہ یہاں بیاہ کر آئی تھی۔ اگرچہ اس کو یہ معلوم تھا کہ وہ نہیں آنے والا تھا لیکن وہ دل کا کیا کرتی' جو اس کے انتظار میں تڑپ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ منظر ابھی تک ٹھہرا ہوا تھا...... روشن ماتھے پر بکھرے گھرے سیاہ بال اور سفید کاٹن میں کسی ہیرے کی طرح چمکتا وہ۔

زرک خان...... جس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ یہ رشتہ محض نکاح کے دو بول تک محدود رہے گا۔

گھر کی چوکھٹ میں' زرک کے پہلو میں کھڑی زرینہ نے بھابھی (ماں' رخسانہ) کو کہتے سنا تھا' وہ اس کے گلے لگے رو رہی تھیں۔

"مجھے معاف کر دینا بچی' میں نے تم دونوں میں تفریق کی۔ بیٹے کے سر قربان کرتے وقت شاید میں نے تمہیں پرایا مان لیا تھا۔ اس وقت میرا دل پتھر ہو چکا تھا اور شاید...... شاید ہر ماں کا دل اس حالت میں پتھر ہو جایا کرتا ہوگا جب بات اس کی اولاد کی زندگی کی ہو...... بچپن میں یتیمی کا دکھ سہا اور اب جوانی میں شوہر کی چاہت کی محرومی...... مجھے معاف کر دینا...... میں مجبور تھی اور ڈرپوک بھی......"

رخسانہ نے فوراً اس کو گلے سے ہٹایا اور اس

کے سر پر قرآن رکھتے۔ بیار قاسم نے اس کو گاڑی تک چھوڑا تھا۔ ڈولی کا رواج حال ہی میں ختم ہوا تھا۔ گاڑی میں اس کے ساتھ کوئی نہیں بیٹھا تھا' فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ زرک خاک بیٹھا تھا اور پیچھے وہ...... بیک ویو مرر میں اس کو اداسی کا دیوتا بنے زرک خان دکھ رہا تھا۔

اس نے اپنی زندگی میں زرک خان کو صرف تین دفعہ دیکھا۔ پہلی بار جب وہ بچور زرک کے دونوں بھائیوں کی شادی میں گئی تھی...... دوسری بار اپنے باپ کی فوتگی میں ......اور تیسری اپنے گھر ...... جب وہ اس کے عین سامنے ٹھوکر کھا کر گری تھی۔

یہ نہیں تھا کہ اس کو محبت تھی اور وہ محبت میں تڑپتی اس کا انتظار کر رہی تھی' بلکہ یہ تو برسوں اپنے دلہے کے سپنے کاڑھنے کی وجہ سے انتظار تھا۔ شادیوں میں اس کی ساری دلچسپی' شادی کے اگلی صبح دلہن کے مسکراتے' کھلکھلاتے چہرے کے پیچھے وجہ جاننے میں ہوتی۔ وہ دلہن کے گرد اس کی سہیلیوں کے جمگھٹے میں چپکے سے شامل ہو جاتی اور ان کی سن گن لینا چاہتی لیکن پکڑی جاتی اور بھگا دی جاتی...... شعور کے دہلیز پار کرتے ہوئے اس کو بھی اپنے دولہے کے سپنے کاڑھنے کا طویل اور نہ تھکا دینے والا مشغلہ ہاتھ لگا تھا۔

"میرا دولہا گھوڑے پر چڑھ کر آئے گا۔" وہ سر اٹھا کر تفاخر سے کہتی۔

"وائی توبہ' اللہ توبہ۔ تم نے پھر سے ملنگ جانے ترور کے گھر وی سی آر پر ہندوؤں (انڈین) کی فلمیں دیکھی ہیں کیا؟" اس کی سہیلی کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتیں۔

"تم مدرسے کی باجی کو شکایت لگا بھی دو تب بھی فرق نہیں پڑتا...... ہاں دیکھی ہیں۔" وہ شرارت سے مسکرا کر کہتی۔ اس کی نبی شہبلا اس کی چٹکی کاٹتی۔

"میسنی!"

میسنی مسکرا دیتی یا پھر ہنس دیا کرتی۔

معاً بادل گرجے وہ عالم تنویم سے نکل آئی۔ تیز ہواؤں کی وجہ سے کھڑکیوں کے پٹ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ بارش کے ساتھ ہوا بھی مست ہوئی تھی۔ وہ جو تکیے پر سر ٹکائے لیٹی تھی۔ معاً اٹھی' دروازے کے ساتھ دیوار میں لگی لالٹین کو اٹھایا۔ اس نے کھڑکیاں بند کیں اور باہر نکل کر زرک کو ڈھونڈنے نکلی۔ نا چاہتے ہوئے بھی زرمینہ کو اس نئی جگہ پر خوف آنے لگا تھا۔

آخری سیڑھی پر اس کے قدم جامد ہوئے تھے۔ وہ جس کے انتظار میں وہ کئی گھنٹوں سے بیٹھی تھی' وہ برآمدے کے سنگی فرش پر سویا پڑا تھا۔ اس کے پیچھے اسٹور کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کو اٹھانا چاہا۔ اگلے ہی پل اس کا چہرہ فق ہوا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں روشن اس کا چہرہ آنسوؤں سے لبریز تھا اور لبوں پر چلتی سرگوشیاں...... وہ سو نہیں رہا تھا' وہ بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے قریب جا کر اس کی سرگوشیاں سننا چاہیں۔

"تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو نا؟" وہ یہی جملہ بار بار دہرا رہا تھا۔

کوئی اور وقت ہوتا' تو وہ اس بات پر خفا ہوتی۔ لیکن اب وہ یہ نہیں سوچ رہی تھی۔ زرمینہ نے زرک کے ماتھے پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ لیکن جھجک کی وجہ سے وہ رکی۔ ان کا رشتہ محض دو بول تک محدود تھا۔ چھونے کا اختیار اس نے نہیں دیا تھا۔ لیکن جانے کیوں اس کو اپنے دل میں لگی یہ عدالت مکروہ لگی اور اگلے ہی پل اس نے زرک کے ماتھے پر ہاتھ رکھا وہ تیز بخار میں جل رہا تھا۔

وہ تیزی سے لالٹین اٹھا کر اندر گئی' کمبل اور تورشکئی (میٹرس) اٹھا کر یہیں برآمدے میں بچھا دیا پھر اس کو دھکا دے کر تورشکئی پر دھکیلا اور اس کو کمبل اوڑھا دیا۔ گرم کمبل میں اس کا پسینہ نکلے گا تو بخار خود ہی اتر جائے گا۔ ماں کہتی تھی یہ۔ وہ اس سے فاصلے پر خود فرش پر تکیہ رکھ کر لیٹ گئی۔

اس کی شادی کی پہلی رات کتنی انوکھی اور کتنی

عجیب تھی۔

☆☆☆

تیز چبھتی ہوئی روشنی اس کے آنکھوں پر پڑ رہی تھیں اور وہ ہاتھ کا چھجا آنکھوں کے سامنے کیے پکے گندموں کے کھیت میں پگڈنڈی پر بھاگ رہا تھا دس سالہ زرک خان۔ اور وہ چلا کر اس کا نام لے رہا تھا' جو اس سے آگے بھاگ رہی تھی......

سرخ خمیر کی طرح پھولے گال' دائیں گال میں پڑتا گڑھا اور سبز شلوار کے اوپر سرخ چھوٹے چھوٹے شیشوں سے بھری قمیص پہنے ہوئے اس کی ہم عمر معلوم ہوتی تھی۔ معاً وہ کھلکھلاتی' چڑاتی بچی نے ٹھوکر کھائی اور اگلے ہی پل وہ چلایا تھا۔

"ثمر!"

ایک چیخ کے ساتھ وہ فوراً اٹھ بیٹھا تھا۔ سورج کی تیز چبھتی روشنی اس کی آنکھوں کو بند کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں مسل کر دیکھا۔ بارش میں بھیگے درخت اور دیوار۔ یقیناً ساری رات بارش برستی رہی تھی۔ پھر اس کی نظر خود پر پڑی۔ جسم پسینے میں بھیگا ہوا اور جسم پر کمبل۔ اس کے دوسری جانب زرینہ سر کے نیچے ہاتھ رکھے اور پاؤں سمیٹے سو رہی تھی۔ اس نے اپنا بناری جوڑا نہیں اتارا تھا۔ اس کے دودھیا پاؤں تازہ مہندی میں رچے ہوئے تھے۔

وہ شرمندہ ہوتا اٹھا تھا۔ کل رات اس کی حالت ابتر تھی۔ ماضی کے کوڑے اس کے روح پر ساری رات برستے رہے تھے۔ وہ رخصتی کے بعد اسٹوڈیو میں گھسا دیوانہ وار اپنا مجسمہ مکمل کر رہا تھا۔ اسٹوڈیو سے نکلتے وقت شاید وہ یہیں برآمدے میں بے ہوش ہوا تھا۔

"اے۔" زرک نے زرینہ کو مخاطب کرنا چاہا۔ اس کی پہلی پکار پر ہی وہ فوراً اٹھی۔ جلدی سے کمبل سمیٹا اور شرمندہ ہوتے کہنے لگی۔

"وہ آپ رات......" زرینہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے کہے' کہ وہ رات کو بے ہوش ہوا تھا۔

"تم چائے پیو گی؟" زرک نے اس کی ہچکچاہٹ کے پیش نظر کہا تھا۔

"میں بناتی ہوں۔" وہ فوراً سے کھڑی ہوئی۔ وہ جانے کیوں زرک کی موجودگی کے احساس سے شرما رہی تھی۔ حالانکہ دل نے یہ باور بھی کروایا کہ وہ محض اس کی بیوی ہے...... صرف نام کی......

"نہیں رکو...... تم بیٹھو میں بناتا ہوں۔ تم تھک چکی ہو گی۔"

"آپ ساری رات بخار میں تپتے رہے ہیں۔"

"سو؟...... رات گئی بات گئی......"

زرک نے اس کو دیکھ کر کندھے اچکائے۔ دونوں کی نظریں ملیں اور اگلے ہی پل اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے زرینہ نے سر جھکایا۔ اتنا کہہ کر زرک ہال و طویل راہداری عبور کرتا دروازے کی طرف کچن میں جا گھسا اور اس کے لیے چائے بنانے لگا۔ جب چائے دو پراٹھے بنا کر وہ اندر کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ کمرے کی حالت یکسر مختلف تھی۔ خالی چارپائیوں پر چادریں بچھی تھیں اور دونوں چارپائیاں دروازے کے عین سامنے رکھی گئی تھیں' صحن کو بیچ میں دیوار کے ساتھ رکھی گئی میز جدا کرتی تھی۔ اس کی کتابوں کا بے ترتیب انبار ترتیب سے بانس کی الماری میں رکھا گیا تھا۔ تکیوں پر نئے نکور غلاف چڑھے تھے اور فرش صاف' چمک رہا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی جادو کی چھڑی تھی' جو اس نے اتنے کم وقت میں اتنا سب کچھ کر لیا تھا۔

"تمہیں اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

وہ چائے رکھتا' الماری میں گھسی زرینہ سے کہہ رہا تھا۔

زرینہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ عروسی لباس بدل چکی تھی اور تیز گلابی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ نیٹ کے دوپٹے میں اس کے گھنے بال کھلے اور بکھرے ہوئے دکھ رہے تھے۔ وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں آسمانی رنگ کے کاٹن کے کپڑے تھے۔ اس نے کپڑے زرک کو دینے چاہے۔ زرک کی نظریں اس

کی نظروں کی تقلید میں اپنے کپڑوں پر گئیں اور وہ شرمندہ ہو گیا۔ اس کے سفید کپڑے مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔

"تردد کی کیوں ضرورت نہیں...... یہ میرا ابھی کمرا ہے۔"

"بالکل۔ بالکل یہ تمہارا کمرا ہے۔ لیکن......" توقف کر کے نرمی سے کہا۔ "یہ میرا کمرا نہیں ہوگا اگر تم اس میں رہنا چاہتی ہو میں اپنا سامان لے کر......"

"نہیں...... نہیں آپ یہیں رہیں۔ میں کوئی دوسرا کمرا تیار کرلوں گی اپنے لیے۔"

زرینہ تیزی سے مڑی اور چائے کی پیالی اٹھا کر کمرے سے باہر نکلی۔

جاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی جھلملا رہے تھے۔ اس کی خوش فہمیوں کا محل دھڑام سے چکنا چور ہوا تھا۔ کانچ کا جو تھا۔ ٹوٹ کر کرچیاں چبھنا تو فرض تھا۔

☆☆☆

زرینہ نے اپنا کمرا الگ کرلیا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں بیٹھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ اپنی قسمت کا ماتم کررہی تھی۔

شروع میں جب باپ کے مہرباں لفظ سے آشنا ہوئی تو باپ اچھا بھلا رات کو سویا تو صبح ہوتے ہی اس کا باپ ہمیشہ کے لیے جاچکا تھا۔ شریک گھرانے میں کوئی مظلوم یتیم نہیں ہوتا۔ ایسا کفایت کاکا کہتے تھے کیونکہ داجی کے چالیسویں کے فوراً بعد انہوں نابالغ قاسم کو تانگا چلانے پر لگا دیا۔ تانگے بان تبدیل ہوا اور قاسم اپنے باپ کی طرح شام کی نیلگوں چادر دھرتی پر چھاتے ہی اپنے دن کی ساری مزدوری کاکا کے ہاتھ پر دھر دیتا تھا۔ لیکن کفایت کاکا کی آنکھوں میں حرص کی روشنی کبھی ماند نہ ہوئی۔ انہوں نے بچپن کیسا محرومیوں میں گزارا' اس کا صرف انہیں پتا تھا۔ آپا گھر کے سارے کام کرتیں' جیٹھانی کے طعنے تشنے سہتیں' لیکن کبھی جیٹھ کے ڈر سے آواز نہیں اٹھائی

پھر قاسم بڑا ہوا اور کفایت کاکا کے بیٹوں کی شادیاں ہوئیں' تو ان لوگوں کو علیحدہ ہونا پڑا۔ ان کی زندگی تھوڑی سہل ہونا شروع ہوئی۔ لیکن اس کا دورانیہ بھی کم رہا' جب قاسم کو اس کی بے نام بیماری نے جکڑ لیا۔ کسی نے اس کو جادو کہا تو کسی نے لاعلاج بیماری۔

زرینہ سارا وقت سارا روتی تھی اس سے بھائی کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ پھر اس رات" بھابھی (ماں) اس سے مولانا صبیر کی بات کہہ رہی تھیں اور وہ سن یک ٹک آسماں کو دیکھتی سوچ رہی تھی۔

اپنوں کی محبت اتنی اندھی کیوں ہوتی ہے؟
آپ صحیح اور غلط میں تفریق ہی کرنا بھول جاتے ہیں
یا پھر صحیح اور غلط معنی ہی نہیں رکھتے......

لوگ کہتے تھے کہ قاسم کے سروار جاتے ہی وہ بیمار ہو جائے گی اور مر جائے گی۔ وہ بیمار ہوئی نہ مری البتہ قاسم ضرور ٹھیک ہو گیا کچھ دنوں بعد۔ اماں نے کچھ اس ڈر سے کہ کوئی کسی کے سرواری گئی لڑکی کو اپنائے گا نہیں اور کچھ اس ڈر کہ ظالم گلاب خان کو وہ انکار نہ کر پائے گی۔ اس کا ہاتھ زرک کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جس نے اس کا ہاتھ صرف آپا کے عزت رکھنے کے خاطر تھاما تھا۔

☆☆☆

باورچی خانے میں صبح کے وقت پراٹھے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ زرینہ سفید شلوار' سادہ فیروزی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ جارجٹ کا دوپٹا اس کے سر پر سے بار بار سرک رہا تھا۔ زرک اندر جاتا رک گیا اور اس کے پشت کو تکتا گیا۔

پشت پر تکی نگاہوں کی حدت پا کر زرینہ نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

"آپ چائے پئیں گے؟" زرینہ اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ تم اپنی چائے بناؤ...... میں خود......" وہ زرینہ کی نظروں کو نظر انداز کرتا' مڑ کر دوسر

بے چولہے پر چائے کے لیے پانی رکھنے لگا۔ زرمینہ اٹھی اور اس سے چھین لیا۔

"نہیں...... میں بناتی ہوں...... آپ جائیے......" اس کے لہجے میں ناراضی اور تلخی تھی۔

وہ کشمکش میں کچھ دیر کھڑا رہا پھر باہر نکل گیا۔ داخلی دروازے کے سامنے برآمدے میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد زرمینہ اس کے سامنے چائے رکھ واپس باورچی خانے میں جانے لگی تھی زرک نے اسے پکارا۔

"ستو......"

زرمینہ کے قدم تھمے تھے۔ وہ رکی لیکن مڑی نہیں۔

"اگر تمہیں کچھ چاہیے تو مجھے......"

زرمینہ نے یک دم پلٹ کر اس کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں حیرت تھی۔ رسمی بات چیت کے علاوہ اسے پہلی بار زرمینہ کا خیال آیا تھا۔ اس کا دل خوش فہمیوں میں گھر گیا۔ ایک مسکان اس کے چہرے پر چھانے لگی۔

"نہیں...... فی الحال نہیں چاہیے۔"

"ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کر اپنی چائے پینے لگا۔

ان دونوں کی ملاقات بس ناشتے، دوپہر اور رات کے کھانے پر ہوتی تھی۔ اس کا سارا دن اپنے اسٹوڈیو میں گزرتا تھا۔ اس دن کے بعد زرمینہ نے ہال کے دوسری جانب والی جگہ پر قدم تک نہیں رکھا تھا۔ اس کو نہیں پتا تھا کہ وہ سارا دن اس جگہ کیا کرتا تھا۔

کچھ دیر تک وہ وہیں کھڑی رہی، اس کو دیکھتی رہی لیکن وہ اس کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ مایوس ہو کر وہ واپس پلٹ گئی۔ باورچی خانے میں آکر جب وہ چوکی پر بیٹھی تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے دل ٹٹولا۔ کیا یہ زرک کے لیے دھڑک رہا تھا؟...... کیا وہ اس کی محبت کی شکنجے میں آچکی تھی؟۔ اس کا جواب واضح تھا اور مبہم بھی...... وہ اس سے منکر ہونا بھی چاہ رہی تھی اور اس کا اقرار بھی کرنا چاہتی تھی۔

وہ فوراً اپنے کمرے آگئی۔ کھڑکی کے کھلے حجرو کے سے اس کو راہداری میں گزرتا زرک دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور آنکھیں اداس...... اس کی آنکھیں تو ایسی نہیں تھیں۔ وہ چمکتی تھیں ستاروں کی مانند۔ کیا وہ اس نغمہ کو ابھی تک بھول نہیں پایا تھا؟۔

اس کی آنکھوں میں منظر بدلا تھا۔ وہ دس سال پیچھے اس مہندی کی رات میں تھی۔

☆☆☆

زرک کے بڑے بھائی کی مہندی تھی۔ جمعے کے روز آسمان بالکل صاف اور ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ سلمی ستاروں کے لہراتے دوپٹوں سے بھری شب میں کھلے وسیع صحن میں، بزرگ عورتیں ٹپے گا رہی تھیں اور جوان لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ پاس کھڑی عورتیں ٹمبل اور ڈھولکی بجا رہی تھیں۔ ایسے میں عورتوں کی جھرمٹ میں دولہے کو اندر لایا گیا مہندی لگانے کے لیے۔ جب مہندی لگ چکی، تو زرک کی بہنوں اور کزنز نے لڑکوں کو زبردستی پکڑ کر عورتوں کے دائرے میں گھسیٹنا شروع کیا۔ کسی نے دائرے میں زرک کو دھکیلا اور پھر اسی ہی سے کسی نے نغمہ کو بھی دھکیلا۔ نغمہ کا چہرہ اسی وقت، اپنے منگیتر کو اپنے سامنے پاکر...... اور سب لوگوں کی لطف اٹھاتیں نظروں کی حدت سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے نکلنا چاہا لیکن اس کی شرارتی سہیلیوں نے راستہ نہیں دیا چونکہ گھر میں کوئی بزرگ مرد نہیں تھا تو عورتوں کو کھلی چھوٹ تھی شرارت کی......

زرمینہ اس کو دیکھ رہی تھی...... چترالی ٹوپی سر پر رکھے اور سیاہ شال کندھے پر...... جس کا ماتھا ویسے ہی روشن تھا اور اس کی آنکھیں ہیروں کی مانند چمک دہ ہو رہی تھیں کیونکہ اس سے اس کی نظروں کا محور، نغمہ تھی...... اس کی نغمہ......

نازبینہ نے ٹمبل بجانا تیز کیا، لڑکیاں تالیاں پیٹنا شروع ہوئیں اور شازیہ باجی نے گانا شروع کیا۔

......

وہ مازیگر بہ شی پہ خپلہ

digest Novels Lovers group

بسم اللہ خورے والے

وہ چناروں نہ سرتہ مہ نجہ بائینہ

زرک کے قدم تھرکنے لگے تھے۔ نغمہ ویسے ہی شرماتی دائرے سے نکلنا چاہ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اناری ہو رہا تھا۔ روخانے نے نغمہ کو دھکا دیا اور نغمہ عین زرک کے سامنے آ گئی۔ دونوں کی نظریں ملیں اور زرینہ مسکراتے زرک سے نظریں نہیں ہٹا پا رہی تھی۔

حلک بارے چنار وے

جیتی وہ گلوں ونہ

اس مصرعے پر سب عورتوں نے فلک شگاف ''اووو'' کی چیخ لگائیں اور تالیاں پیٹیں۔ نغمہ مڑی اور تیزی سے دائرے میں جگہ بناتی بھاگ گئی۔ زرینہ زرک کو دیکھے جا رہی تھی جو مسکراتا لطف اندوز ہوتا ناچ رہا تھا۔ گیت کے بول اور زرک کا مسکرانا' اس کے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''مجھے میکے چھوڑ آئیے۔'' یہ اس کی زرک کے ساتھ اس مہینے پہلی باضابطہ بات تھی۔ زرک چھت پر بیٹھا خاموشی سے کھیتوں پر چھائی سرما کے اواخر کی سہ پہر کو دیکھ رہا تھا۔ گنے ابھی چھوٹے تھے اور اس پر بجھتے شعلوں سی روشنیوں کی چادر تن رہی تھی۔

''تم خود چلی جاؤ۔'' زرک نے آہستہ سے نظر نہ ملاتے ہوئے کہا۔

''اس پورے دو مہینوں میں صرف دو بار پر گئی تھی۔ اس میں بھی آپ جلدی آ گئے تھے دعوت سے پہلے۔ اب بھی اگر میں اتنے عرصے بعد اکیلی جاؤں گی تو بھابھی کو برا لگے گا......'' توقف کر کے اس نے زرک کی اداس آنکھوں میں دیکھا تھا۔ ''اور مجھے بھی ......نام کا رشتہ ہی سہی' لیکن یہ حق تو ابھی میں رکھتی ہوں۔''

وہ خاموشی سے ڈھلتے سورج پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس وقت وہاں موجود ہی نہ تھا۔ زرینہ کو رونا آنے لگا۔ وہ اتنا بے حس کیوں تھا۔

''آپ میری بات کن رہے ہیں؟'' وہ قدرے تیز لہجے میں بولی تھی۔ اس کی تیز آواز پر زرک نے مڑ کر اس کو دیکھا۔ زرینہ نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں انتہائی سرخ تھیں ایسے جیسے وہ روتا رہا ہو۔ اگلے ہی پل وہ اٹھا اور نیچے جانے لگا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے زرینہ نے اس کے لرزتے ہاتھ دیکھے تھے۔

اس کا دل چاہا کہ وہ پوچھے لیکن اس نے خود کو روک دیا' اس کو کیا ضرورت تھی پوچھنے کی۔ جب اس کو زرینہ کی پروا نہ تھی تو وہ کیوں کرتی بھلا۔ وہ غصے اور دکھ سے وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ وہ اس کے قریب جانا چاہتی تھی لیکن وہ ہمیشہ اس کو یا نظر انداز کر دیتا یا پھر یا اس کو دور ہونے کا کہتا..... اس نے طے کر لیا کہ وہ اس سے اس کی قربت کی بھیک نہیں مانگے گی۔ وہ لاتعلق رہنا چاہتا ہے' اس کو قبول ہے۔ لیکن وہ یہ بھول رہی تھی کہ محبت جب دل کی سرزمین میں جڑیں ڈال دے تو ان جڑوں کو اکھاڑا نہیں جاتا اور نہ ہی وہ کاٹی جاتی ہیں..... دونوں صورتوں میں ہاتھ دل کے خون سے رنگنے ہوتے ہیں......

شام کو وہ کھانا بنا کر لاشعوری طور پر اس کا انتظار کرتی رہی۔ شاید وہ کھانا کھانے آ جائے۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ دوپہر کے وقت بھی اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ لیکن وہ اس کے اسٹور جانا نہیں چاہتی تھی' جس میں وہ سارا دن تالا لگائے گھسا رہتا ہے۔

جب سورج مکانوں کے عین اوپر سرک گیا اور وہ دوپہر کے کھانے کے لیے بھی اپنے اسٹور سے نہ نکلا تو اس کو تشویش ہونے لگی۔ وہ چنگیر اور کاسہ اٹھائے اس کے اسٹور جانے لگی۔ اگرچہ اس کو یقین تھا کہ آگے سے دھتکار اس کا مقسوم تھا لیکن پھر بھی وہ گئی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس نے پاؤں سے دروازہ دھکیلا اور اندر چلی گئی۔ اندر پہلا قدم رکھتے ہی اس کے قدم جم گئے تھے......

ایک بڑا سا خالی کینوس۔ ایک بڑی سی میز'

جس پر ایک خالی اسٹینڈ تھا اور میز پر گارا' سیلی کان' ربڑ' گلو برش اور باقی چیزیں جنہیں وہ جانتی تک نہ تھی لیکن یہ چیزیں اس کے تحیر اور جمود کا باعث تھیں۔

وہ یک ٹک ان مجسموں کو دیکھ رہی تھی...... ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ...... اس کی نظریں مجسموں کو گنتے ہوئے گھوم رہی تھیں۔ پورا کمرا مجسموں سے بھرا ہوا تھا۔ سفید مجسمے۔ جس میں روح نہیں تھی لیکن اس کی ہیئت مکمل بشری تھی۔ وہ آگے بڑھی۔ آنکھوں میں آنسو چمکے۔

اس نے مجسمے کو دیکھا۔ مسکراتا چہرہ' بڑی آنکھیں' کتابی چہرہ اور خوب صورت لب۔ وہ اس مجسمے کو جانتی تھی۔ اس پتھر سے بنے انسان کو جانتی تھی۔

وہ نغمہ تھی۔ نغمہ حبیب اللہ۔ لیکن اس کمرے میں ایک نغمہ نہ تھی۔ کئی نغمہ تھیں...... مختلف انداز میں۔ کبھی ہنستی' کبھی روتی' کبھی اداس' کبھی غصہ۔ اس پورے کمرے میں صرف نغمہ کے مجسمے تھے۔

اس کی نغمہ' جس کے لیے وہ نیچے فرش پر لیٹا سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ آنسو کی ایک لمبی لکیر اس کے چہرے پر بہہ رہی تھی۔

اس پورے عرصے' زرمینہ اس سے محبت کی امید لگائے بیٹھی تھی جو محبت میں مجنوں تھا۔ غافل تھا۔ اس کے دل میں چبھتا ہوا درد کسی زہر کی طرح پھیلنے لگا۔ اس کا دل دو حصوں میں بٹنے لگا۔ ایک حصہ زرک کے لیے تڑپ رہا تھا اور ایک حصہ اپنے لیے۔ ایک آخری امید جو بچی تھی وہ ان مجسموں کے ساتھ ہی پتھر ہوگئی۔ محبت درد نہیں دیتی...... محبوب کا کسی اور کو یوں چاہنا درد دیتا ہے۔

وہ کس کرب سے گزر رہا تھا۔ اس کمرے کی ہر ایک چیز اس کی گواہ تھی۔ وہ فوراً اس کو اٹھانے جھکی۔

"تم تو مجھ سے محبت کرتی ہونا؟"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں نغمہ!"

زرک کی آنکھوں کے سامنے جھکی' اس کو آوازیں دیتی زرمینہ نہیں دکھائی دے رہی تھی...... وہاں کوئی اور مناظر تھے۔ اس کے...... اس کی نغمہ کے...... اور

☆☆☆

پچاس سال پہلے:

دروازے پر دستک ہو رہی تھی اور مشتری بی بی دستک دینے والے کو پہچان گئی تھیں۔ وہ باچا خان تھے۔ وہ چپل پہنتے' لالٹین اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھیں۔

ان کے شوہر باچا خان تین دن پہلے صوابی اپنی خالہ زاد بہن سلطانہ بی بی کے ہاں جرگے میں گئے تھے۔ سلطانہ بی بی کے خاوند کو فوت ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے اور دونوں کی شادیاں ایک ساتھ ہی ہوئی تھیں۔ پورے خاندان میں مشہور تھا کہ باچا خان سلطانہ بی بی کے لیے انس رکھتے تھے۔ جرگہ اس لیے بٹھایا گیا تھا کہ سلطانہ کے دیور نے ان پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

مشتری نے جیسے دروازہ کھولا۔ ان کے سامنے دراز قد باچا خان' دستار باندھے اور کندھے پر چادر رکھے ہوئے کھڑے تھے۔ وہ مسکرائی تھیں لیکن اگلے ہی لمحے ان کی مسکراہٹ کٹی کیونکہ ان کے چوڑے شانوں کے پیچھے تین ہیولے نمودار ہوئے اور ان کے چہرے لالٹین کی مدھم زرد روشنیوں میں واضح ہوئے۔

سلطانہ اور ان کے بچے...... دو بالغ بیٹے......

مشتری نے راستہ دیا اور وہ اندر چلے آئے۔

"ان کے لیے چارپائیاں رکھوا دو کمرے میں۔" باچا خان نے بس اتنا ہی کہا اور خود مٹکے سے پانی پی کر کھلے آسمان تلے سو گئے۔

اگلی صبح باچا خان نے اپنی بہنوں اور بھائیوں کو اکٹھا کیا۔ اس کچے کمرے میں پورے خاندان کے بڑے موجود تھے۔ عورتوں سمیت۔

"اس بے غیرت لال محمد نے سلطانہ پر ہاتھ اٹھایا اتنا مارا کہ وہ آدھا دن بے ہوش رہی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ اس نافرمان کو گھر میں نہیں رکھ سکتے۔ اور

سلطانہ کے بھائی بھی کہہ رہے تھے کہ اب اس کا اصل گھر اس کے مرحوم شوہر کا گھر ہے۔ وہ اس گھر سے اب میت کی صورت ہی نکلے گی۔

"میں نے سمجھانا چاہا۔ لیکن اس کے بھائی نہ مانے۔ پھر لال محمد نے مجھے طعنہ دیا کہ اتنی ہی پروا ہے تو تم اس سے شادی کرلو اور لے جاؤ، اس کا بوجھ اٹھاؤ اور اس کے بیٹوں کا بھی ......" اس سے آگے باچاخان خاموش ہوگئے کیونکہ آگے کی ان کہی بات کا مفہوم سب سمجھ گئے۔

مشتری یک ٹک باچاخان کو دیکھ رہی تھیں۔ ایسے جیسے کسی نے ان کو مجسمہ بنادیا ہو۔ وہ بیٹھی رہیں۔ ان کی نندیں ان کو تسلیاں دیتی رہیں' لیکن وہ خاموش تھیں۔

رات کو جب باچاخان اپنا واسکٹ اتارنے کمرے میں آئے تو ان کے پہلو میں بیٹھ کر بولے۔

"میں تم سے بس ......بس عدل کی درخواست کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ انصاف کرنا۔ دل بڑا کرنا۔"

وہ سر جھکائے خاموشی سے بیٹھی رہیں پھر انہوں نے اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اٹھائیں۔ "قبول بھی کرلیا اسے' انصاف بھی کرلوں گی۔ لیکن دل بڑا نہیں کرسکتی......اس کو تو آپ نے نچوڑ کر رکھ دیا۔"

پھر سب نے دیکھا۔ مشتری بی بی نے سلطانہ کے ساتھ کبھی زیادتی نہ کی۔ نہ ہی کبھی روایتی سوتنوں والے جھگڑے اور سیاست۔ انہوں نے سلطانہ کو قبول کیا۔ سلطانہ مشتری بی بی کی بہت عزت کرتی تھیں۔ لیکن اس سب احسانات' کو وہ نہیں دیکھ رہے تھے۔ حبیب الرحمٰن اور بخت الرحمٰن۔ سلطانہ کے بیٹے۔ انہوں نے کبھی مشتری کو غٹہ مور (بڑی ماں) نہ سمجھا اور نہ ہی باچاخان کو 'داجی'......ان کا اپنی ماں کے ساتھ بھی اچھا تعلق نہ رہا۔ وہ اپنے خاندان' اپنے گاؤں میں رہنا چاہتے تھے۔ اور ان کے اندر زہر بھرنے کا فریضہ گاؤں والوں نے نبھایا تھا اور کچھ رشتے داروں نے......

"سلطانہ اور باچاخان پہلے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔"

"سلطانہ مشتری سے جلتی تھی کہ بھی ساری جائیداد پر ناگن بن کر بیٹھی عیش کررہی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے پہلے شوہر کو مارا۔ یہ سانپ کے زہر سے مرنے کا تو بس بہانہ تھا۔ اس کو تو بس اپنے یار سے ملنے آنا تھا۔"

"سلطانہ کے شادی کے بعد بھی باچاخان سے مراسم تھے۔"

"بے حیا عورت......بے چاری مشتری......"

ہر زبان پر نیا طنز' نئی گالی اور نئی تہمت تھی۔ رفتہ رفتہ ان کو باچاخان اور ان کے بچوں سے نفرت ہونے لگی۔

باچاخان کے اپنے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ رستم خان' ہاشم خان' بابر خان اور گلنار' شہناز' نسرین اور عذرا۔ باچاخان نے انہیں مدرسے میں داخل کروایا اور وہ وہاں دین و اسلام کے اسباق سیکھنے لگے لیکن ان کے اندر کا بغض اور عناد کم نہ ہوا اور مزید جڑیں پکڑنے لگا۔ باچاخان نے انہیں اپنی اولاد ہی سمجھا۔ سلطانہ کے لیے الگ حصہ تعمیر کروایا اپنے گھر میں اور جائیداد میں سے بھی برابر کا حصہ دیا۔

باچاخان اور مشتری جب تک زندہ رہے انہوں نے اپنی طرف سے ہر قسم کی میانہ روی' عدل وانصاف کیا لیکن تب بھی حبیب الرحمٰن اور بخت الرحمٰن ان کو اچھی نظروں سے نہ دیکھتے۔ یہ ان دو بھائیوں کی کم ظرفی تھی شاید۔ پھر وہ بچے بڑے ہوگئے۔ ان کی شادیاں ہوئیں۔ باچاخان کے پوتے' پوتیاں ہوئیں۔ اور اب سگے سوتیلے بھائیوں میں ان کی بیویوں کے باعث تھوڑا بدلاؤ آیا تھا۔

☆☆☆

اس بڑے سے لکڑی کے دروازے کے پاس بیل گاڑیاں رکیں اور اندر سے کسی خاتون نے

digest Novels Lovers group
UrduNovels.com

دروازہ کھولا۔ اب بیل گاڑیاں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ بیل گاڑیاں گندم کی بوریوں سے لدی تھیں اور اندر گھر میں افراتفری سی مچی تھی۔ کھیتوں میں کام کرتے مردوں کے لیے چائے بنائی جا رہی تھی۔ اور بچے بیل گاڑیوں کے خالی ہونے کے انتظار میں اچھلتے کودتے جا رہے تھے۔ جیسے ہی بوریاں اٹھا کر گودام میں رکھوا دی گئیں تو سارے بچے بیل گاڑیوں پر ہلا بول کر بیٹھ گئے۔

سرکاری اسکول کے سیاہ کپڑے پہنے زرک خان جیسے ہی بیٹھا' تو اس نے مڑ کر پہلے اپنی بیل گاڑی میں دیکھا اور پھر باقی سب میں نغمہ ان میں کسی سے میں بھی نہیں تھی...... اگلے ہی پل وہ کودا تھا۔ اس کے بھائی نے اس کو پکارا لیکن وہ رکا نہیں اور تیزی سے بھاگتا ہوا نغمہ کو ڈھونڈنے گھر چلا گیا۔ جیسے ہی گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وسیع صحن میں نغمہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی' روئے جا رہی تھی۔ اس کے پاس سلطانہ دادی کھڑی اس کو دلاسے دے رہی تھیں۔

''دیکھو...... زرک خان بچے می راغو ورلہ (تمہارے لیے میرا زرک خان بچہ آ گیا)......''

ان کی بات پر نغمہ نے اپنی آنسوؤں سے تر آنکھیں اٹھائیں اور اس کو دیکھا تو مسکرائی۔ زرک نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دونوں باہر کی اور پچھلے راستے نکل کر کھیتوں میں داخل ہوئے تھے۔

سورج کی سنہری روشنی' گندم کے سنہرے خوشوں پر پڑتی' منظر کو مزید روشن کر رہی تھی۔ نغمہ اس سے آگے پگڈنڈی پر بھاگ رہی تھی اور وہ اس کے پیچھے...... معاً وہ ٹھوکر کھا کر گری۔

''نغمہ!''

زرک خان نے اس کو پکارا جو تکلیف سے اپنے پیروں کی انگلیوں کو دیکھنے لگی تھی۔ لیکن اس سے زیادہ تکلیف میں وہ تھا۔ وہ تشویش سے اس کے پیروں کو دیکھا جا رہا تھا۔

''ہم سے گندم رہ جائے گی...... باقی سب گندم بیچ کر اپنے لیے پیپسی' چپس سب لے لیں گے۔'' وہ مایوسی سے زرک سے کہہ رہی تھی۔ زرک کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کو باقی بچوں کے ساتھ نہ جانے کا دکھ تھا۔

زرک نے ارد گرد دیکھا۔ اس کو دور چکنی مٹی نظر آئی۔ اس نے اٹھ کر ڈھیر ساری مٹی اٹھا کر وہاں پگڈنڈی پر رکھی۔ نغمہ اس کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہاں بیٹھ کر اس نے چکنی مٹی سے چڑیا بنانی شروع کی۔ نغمہ اپنا درد بھولے' اشتیاق سے مٹی کی ہیئت بدلتے دیکھ رہی تھی۔

''تم کیا بنا رہے ہو؟''

''چڑیا۔''

''چڑیا...... یہ چڑیا ہے؟'' اس نے اس کے ہاتھ میں مٹی کو دیکھا اور پھر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنس پڑی اور ہنستی چلی گئی لیکن وہ مسکراہٹ دبائے لگا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ جب وہ چڑیا بنا چکا تو وہاں درخت کا باریک کانٹا اٹھا کر اس کے پروں میں پنکھ بنانے لگا اور باقی خدوخال...... جب بنا چکا تو اس نے نغمہ کے سامنے رکھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ چکا تھا۔

''یہ کیسے؟'' وہ مٹی سے بنی اس چڑیا کو دیکھتی متحیر تھی۔ ''اور بھی بناتے ہیں زرک!''

زرک نے مسکرا کر اور سر اثبات میں ہلایا۔ پھر وہ دونوں دوپہر کا کھانا بھولے سہ پہر کی اذان تک وہیں بیٹھے کھلونے بناتے رہے۔ تب تک جب تک ان کو کوئی ڈھونڈنے وہاں نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

نغمہ حبیب الرحمٰن کی بیٹی تھی اور زرک رستم خان کا بیٹا...... اس بڑے گھر میں بچوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا تھا۔ زرک کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ زرک سب سے چھوٹا تھا۔ نغمہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ زرک سارا دن نغمہ کے گھر ہوتا یا نغمہ پورا دن زرک کے حصے میں ہوتی۔ نغمہ صرف مدرسے جاتی تھی بھائیوں کے ساتھ' جبکہ زرک اسکول بھی جاتا تھا......

اس دن کے بعد، نغمہ ہمیشہ اس کو کھلونے بنانے کی فرمائش کیا کرتی تھی۔زرک کے ہاتھوں میں قدرتی صلاحیت تھی۔وہ کسی چیز کو دیکھ لیتا، تو من وعن اس کو ویسا بنا دیا کرتا تھا۔دوپہر کو وہ دونوں گھر کے پیچھے والے حصے میں بڑ کے نیچے بیٹھے کھیلتے، زرک صاف کورے صفحات پر پنسل سے تصاویر بنایا کرتا اور نغمہ اس کو شوق سے دیکھا کرتی۔

یہ تیز دھوپ سے بھری دوپہر کا قصہ تھا۔زمین تانبے جیسی چمک رہی تھی اور وہ دونوں اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھے تھے۔ایسے میں نغمہ کو ڈھونڈتا اس کا بھائی نیک احمد اس جانب آیا تھا۔زرک کے ساتھ بیٹھی نغمہ ٹھوڑی تلے، ہتھیلی رکھے اشتیاق سے زرک کو کورے صفحے پر پنسل سے تصویر بناتے دیکھ رہی تھی۔نیک احمد قریب گیا۔

"نغمے...... بے بے بلا رہی ہیں......"

نغمہ بیٹھی رہی، نیک احمد اس کے قریب جھکا۔

"یہ تم کیا بنا رہے ہو؟"

"یہ رستم کا کا ہے۔" نغمہ جوش سے بتا رہی تھی۔زرک انہماک سے تصویر بنا رہا تھا اور اس کی تصویر ہو بہو رستم کا کا جیسی تھی۔

نغمہ کو یونہی بیٹھا دیکھ کر نیک احمد غصہ ہوا اور اس کو بازو سے پکڑ کر کھینچا تھا۔"تم ابھی تک بیٹھی ہو اٹھو......"

"بس کچھ دیر......" نغمہ منمنائی لیکن نیک احمد اس کو گھسیٹتا لے گیا۔زرک کا دل اچاٹ گیا۔

نیک احمد ہمیشہ زرک سے جلتا تھا۔اس کی مثالیں دی جاتی تھیں ہر جگہ۔اسکول کا کے ماسٹر صاحب، یا مدرسے کے قاری صاحب۔سب اس کی تعریفیں کرتے تھے۔وہ اتنا ذہین تھا۔

نیک احمد صرف نام کی حد تک نیک تھا، ورنہ اتنا شرراتی لڑکا پورے گاؤں میں نہ تھا کوئی۔سب اس سے عاجز تھے۔

مدرسے کے اس پرانے طرزِ تعمیر کے ہال میں بچے قطاروں میں آمنے سامنے بیٹھے رحل پر جھکے سبق ہل ہل کر پڑھ رہے تھے۔نیک احمد اپنی قطار میں بیٹھا، جیب میں رکھے چھوٹے چھوٹے تخم بکائن سے ایک ایک لڑکے کا نشانہ بنا کر ان کو مار رہا تھا۔ایسے میں ایک بچے نے اس کو دیکھ لیا اور اٹھ کر قاری صاحب سے شکایت لگانے لگا۔

"قاری صیب۔یہ تخم بکائن سے ہمیں مار رہا ہے......"

قاری صاحب اشتعال میں اس کو بلانے لگے۔نیک احمد جیسے ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے نیک احمد کی جیب ٹٹولی۔اس میں تخم بکائن بھی تھے اور ایک سفید مروڑا ہوا کاغذ...... جو اس نے کل دوپہر زرک کے صفحات سے چرایا تھا۔انہوں نے جیسے ہی صفحے پر بنی تصویر دیکھی تو غصہ ہو کر پوچھنے لگے......

"یہ کس کی تصویر ہے؟"

ان کی آواز میں دھاڑ تھی۔نیک احمد اب صحیح معنوں میں ڈر گیا۔

"یہ رستم کا کا کی......"

"کس نے بنائی تھی؟ تم نے؟"

"نن...... نن...... نہیں...... یہ تو...... زرک نے بنائی ہے۔وہ تصویر بناتا ہے۔اس کے پاس اتنے سارے صفحوں پر بہت ساری تصویریں ہیں۔آدے کی، رستم کا کا...... اور......"

قاری صاحب نے اس کو بیچ میں ٹوک کر غصے سے زرک کو بلایا تھا۔زرک نچلا لب کاٹتا ان کی جانب جا رہا تھا اور نغمہ یک ٹک خوف سے زرک کو دیکھ رہی تھی۔کیا قاری صیب اس کو مارنے والے تھے؟

"ادھر بیٹھو۔" انہوں نے زرک کو اپنے سامنے بیٹھنے کا کہا اور پہلو میں رکھا ڈنڈا بھی اپنے عین سامنے رکھا۔

"یہ تم نے بنائی ہے؟"

"جی۔" تھوک نگل کر اس نے کہا تھا۔تڑاخ سے ایک ڈنڈا اس کے بازو پر مارا گیا اور اس کے فوراً بعد قاری صاحب نے اس پر ڈنڈوں کی برسات کر

دی۔زرک کی چیخیں آسماں کو چھونے لگیں۔

"ملعون انسان۔تم اب تصویریں بناؤ گے۔ خدا کے عذاب میں جلو گے۔جہنمی! یہ خدائی وصف ہے۔انسان کے چہرے نہیں بناتے......آخرت میں روح ڈالو گے اس میں ...... ہے روح ڈالنے والی قوت تم میں؟" قاری صاحب اس پر جھکے پوچھ رہے تھے۔بھری بھری آنکھوں سے اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔"پھر بناؤ گے؟ بولو؟"

اس کا سر نفی میں بار بار ہل رہا تھا۔جب اس کو مارتے مارتے وہ تھک گئے تو انہوں نے بس کر دی۔

چھٹی تک وہ رحل پر جھکا ہچکیوں سے روتا رہا تھا۔

مغرب کی نماز کے بعد سلام پھیرنے کے بعد قاری صاحب نے رستم کاکا کو سب کے سامنے اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اس راستے سے ہٹائیں، ورنہ اللہ کی پھٹکار پڑے گی۔پہلی صف میں بیٹھے رستم کا سر شرم سے جھک گیا۔

رات کو جب مورجانہ زرک کے زخموں پر تیل لگا رہی تھیں تو بار بار قاری صاحب کو بددعائیں دے رہی تھیں۔

"اللہ اس کے ہاتھ توڑ دے جو میرے معصوم بچے کو ایسے ظالموں کی طرح کوٹا۔ایک تصویر ہی تو تھی، نرمی سے سمجھا دیتے، نہ بناتا وہ آگے سے۔"

"تمہاری دی گئی شہ ہے جو یہ اس طرح کے لعنت و کفر کے کام کرتا ہے۔" ان کے پیچھے رستم خان کی آواز آئی تھی۔مورجانہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔"کہاں ہیں؟ وہ باقی تصویریں؟ اٹھو لاؤ۔" وہ آگے بڑھ کر زرک کو بازو سے پکڑ کر اٹھانے لگے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ وہ اتنا......"

"تم چپ...... بالکل چپ......اٹھو......"

زرک روتا بلکتا اٹھا اور اندر چلا گیا۔کچھ دیر بعد جب وہ باہر آیا تو گھر کے صحن میں سبھی موجود تھے اور رستم کاکا کے اشتعال پر دم سادھے ہوئے تھے۔سلطانہ آدے اس سے استفسار کر رہی تھیں لیکن وہ جواب نہیں دے رہے تھے۔ایسے میں زرک نکلا تو اس کے ہاتھ میں صفحات کا پلندہ تھا۔

رستم خان نے اس کے ہاتھ سے صفحات چھینے۔اور ایک ایک کر کے سب دیکھنے لگے۔ان تصویروں میں زیادہ تصویریں رستم خان کی تھیں۔لیکن وہ یہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ زرک ان سے کتنی محبت کرتا تھا کہ ساری تصویریں ہی ان کی اور نغمہ کی تھیں۔وہ آگے بڑھ کر جاری میں جلتی آگ میں وہ سارے کاغذات ڈال کر اس کی طرف مڑے۔

"تم آئندہ بناؤ گے؟" وہ یقیناً اس کو مارتے جارہے تھے۔وہ بھاگ کر سلطانہ آدے کی آغوش میں جا چھپا۔

"غضب خدا کا۔پہلے اس ظالم نے مارا اور اب تم مار رہے ہو۔کوئی اللہ کا خوف ہے کہ نہیں؟ نہیں بنائے گا اب خبردار جو اس کو ہاتھ بھی لگایا تو......" سلطانہ آدے غصے سے بول رہی تھیں اور اس کی روتی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں اس کے شوق کے شعلے بجھتے جارہے تھے۔

نغمہ دور کھڑی روتے ہوئے اپنے دوست کو دیکھ رہی تھی......وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی......وہ ڈرپوک تھی، پھر روتے ہوئے پیچھے مڑ کر اپنے گھر کی اور بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

اس دن کے بعد زرک کا رستم یعنی اپنے باپ کے ساتھ رویہ بدل گیا۔وہ جس قدر اپنے باپ کو چاہتا تھا، ان کی تصویریں بناتا تھا۔ان کے آگے پیچھے گھومتا تھا۔اب اس چاہت پر ان کا خوف بھاری پڑ گیا۔اس دن کے بعد زرک کی زندگی بہت بدل سی گئی۔

وہ خوش رہنے والا معصوم زرک، خاموش طبع بن گیا۔اس کی زندگی میں بس دو ہی ایسے لوگ تھے، جن کے سامنے وہ رو سکتا تھا۔مورجانہ اور نغمہ!

"تم اب بھی تصویر نہیں بناؤ گے؟" نغمہ مغموم سی اس سے پوچھتی۔

"نہیں۔"

"کبھی نہیں؟"

"کبھی نہیں۔"

یہ چھوٹا حادثہ اس کی ذات کے سفال کو کسی اور ہیئت میں ڈھال رہا تھا۔ وقت کے کمہار ہاتھوں میں شتابی تھی اور اس کی ذات کے سفال کو اس نے "طفل" سے "جوان" میں بدل دیا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم دھرتے ہی' اس کے اور نغمہ کے رشتہ کی نوعیت بدل گئی۔ اب وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر' پگڈنڈی پر نہیں بھاگ سکتا تھا نہ ہی پچھواڑے میں بڑ کے درخت کے نیچے وہ گھنٹوں کھیل سکتے تھے۔ حیا کی ایک دبیز چادر ان کے بیچ کھنچ گئی لیکن ان کے درمیان ان کی محبت ویسے ہی قائم تھی۔

☆☆☆

کھلے آسمان تلے' بالائی منزل میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی...... وہ فوراً کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے لگی۔ اگلے ہی پل اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔

نیچے کھڑا زرک اس کو سر اٹھائے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں لیکن چہرہ مسکراہٹ سے مبرا تھا۔

"یہ گلاب کس لیے؟" نغمہ کھڑکی کے چوکھٹے میں دونوں کہنیاں جما کر اب پوری دلجمعی سے اس کو دیکھنے لگی۔

"تمہارے لیے۔"

"تم مجھے گلاب اس طرح دو گے؟...... میرے گالوں پر دے مار کر؟"

"تم اس طرح کھڑکی میں کھڑی رہو گی تو......"

"اور اگر میں کھڑکی میں نہ کھڑی ہوں تو؟"

"پھر تمہارے بالوں میں سجاؤں گا۔"

"آدے کہتی ہے جوان لڑکیوں کے بالوں میں پھول نہیں سجاتے...... جن عاشق ہو جاتے ہیں۔"

"آدے مجھے بھی جن کہتی ہیں۔"

اس کے جواب پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آدے یہ بھی کہتی ہے کہ تم صرف باتیں بگھارتے ہو۔ صرف باتیں ہی کر سکتے ہو بالوں میں پھول لگانے کی......"

"اور تم ڈرپوک ہو، بھاگ جاتی ہو۔"

"وائی اللہ توبہ...... دمرہ سپین دروغ؟ (سفید جھوٹ!)"

"آؤں اب اوپر...... پھول لگانے؟"

"بالکل...... آؤ...... میں بھی دیکھوں ہمت......" نغمہ نے اس کی ہمت آزمانی چاہی۔ زرک فوراً بڑ کی اور بڑھا۔ کیونکہ بڑ کی ایک بڑی شاخ چھت سے ملتی تھی۔ وہ دلچسپی سے اس کو چڑھتا دیکھ رہی تھی کہ اگلے ہی پل اس کے چہرے کا رنگ اڑا۔

"اللہ...... وائی......" نغمہ کی آواز میں وحشت تھی۔

وہ جو تھوڑا اوپر چڑھا۔ فوراً کودا تھا لیکن سنبھل نہ سکا اور گر گیا۔ اس کے گرتے ہی کھڑکی سے 'کھی کھی' کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ نغمہ کھڑکی میں کھڑی اس پر ہنستی جا رہی تھی۔ زرک نے ارد گرد دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا اور وہ مسلسل ہنسے جا رہی تھی۔

"آدے تمہیں پاگل اس لیے کہتی ہیں کہ چھت پر آنے کے لیے درخت نہیں' سیڑھیوں کا استعمال کیا جاتا ہے...... لیونیا (پاگل)......" یہ کہہ کر وہ منہ پر ہاتھ رکھے ہنستی چلی گئی۔ وہ منہ بناتا فوراً باہر چلا گیا۔ حالانکہ اس کو مور جانے نے کسی کام کے لیے بھیجا تھا۔

☆☆☆

بڑے قبرستان کے ارد گرد سفیدے کے بڑے بڑے قد آور درختوں کا جھنڈ تھا۔ قبرستان کے سامنے بڑی مسجد کے کھلے دروازے سے لوگ نکل رہے تھے۔ کہرا بڑھتا جا رہا تھا اور شال اوڑھے زرک کے سر پر نماز کی ٹوپی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی اور جا رہا تھا۔ پکی سڑک کا راستہ طویل تھا۔ سو اس نے بڑے قبرستان کے سفیدے کے جھنڈ والا راستہ

اپنایا۔ معاً اس کو سامنے چادر کے نیچے چھپے بندے کے منہ میں جلتا ہوا سگریٹ دکھائی دیا......

"کون ہو؟" اس نے احتیاطاً پوچھا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچا۔ اب تھوڑی بہت شام کی نیلی روشنی میں اس کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ چرس کی کسیلی بو اس کے ناکوں میں گھس رہی تھی۔

"تم...... یہ......" وہ ششدر سا نیک احمد کو دیکھ رہا تھا، جس کے منہ میں چرس سے بھرا سگریٹ دبا تھا۔

نیک احمد کے سر پر نشہ چھا چکا تھا۔ وہ اس کو نہیں سن رہا تھا۔ اس نے نیک احمد کو بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا لیکن نیک احمد نے اس کو دھکا دیا اور بھاگتا ہوا دوسری جانب گم ہو گیا...... جاتے ہوئے اس کے پشت پر چادر سرک کر گری تھی۔ زرک نے جھک کر اس کی چادر اٹھالی۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھا سلطانہ آدے کے گھر گیا۔ ان کے صحن میں اندھیرا تھا اور دور کمرے کے ادھ کھلے دروازوں سے بجلی کی روشنی نکلتی، یہ آمدے کی لیپ شدہ زمین پر پھیل رہی تھی۔ چارپائی سے دھواں اٹھ رہا تھا اور اسی سمے شاہ گل باہر نکلی تھیں۔ اس کو وہیں رکے دیکھ کر استفسار کرنے لگیں۔

"رازہ کنہ؟ (آؤ تاں) وہاں کیوں کھڑے ہو؟"

اس نے گہری سانس لی، سو اس کو شاہ گل کو بتانا چاہیے۔ حبیب الرحمن کاکا کو بتا دیتا تو شاید اس کو مار پڑ جاتی۔

"شاہ گل! میں گیا تھا نا ہے ترور (پھپھو) کے گھر کوز کندے (نچلا محلہ)۔ موز جاتے نے دیسی گھی دیا تھا، ان کی بہو کے لیے...... وہاں نماز پڑھ کر میں بڑے قبرستان کے راستے آنے ہی والا تھا کہ وہاں مجھے سفیدے کے جھنڈ میں نیک احمد ملا......" وہ آگے کے جملہ بولنے کے توقف کر کے گہری سانس لے رہا تھا۔

شاہ گل کا چہرہ زرد سا پڑنے لگا، وہ اس جگہ کی بری شہرت سے واقف تھیں۔

اسی سمے ان کے پیچھے کھڑا حبیب الرحمن ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ شاہ گل کے چہرہ مزید سفید پڑ گیا۔ انہوں نے اشارے سے زرک کو بتانے سے منع کیا۔ زرک آہستگی سے چادر چھپانے لگا۔

"کیا کر رہا تھا وہ؟" اس کو خاموش پا کر اس نے انہوں نے اس کے ہاتھ سے چادر جھپٹی اور اس کو سونگھا۔ چرس کی دبی دبی بو ان کے نتھنوں سے ٹکرائی اور ان کے بے ڈھب وبڑے سے ابرو ترچھی ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہونے لگے۔ "لباس خانہ علی خانہ"

کاکا جی چیخ کر اندر کمرے میں گڑ کی چائے کی چسکیاں اڑاتے اپنے بیٹوں کو پکارنے لگے۔ ان کی پہلی آواز پر دونوں فوراً باہر نکلے۔ ان کے چہرے پر اڑتے غیض و غضب کی پرچھائیں دیکھ کر ان کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ان کی چیخ پر باقی سب بھی باہر نکل آئے۔

"جاؤ اور بڑے قبرستان سے اس کم بخت کو ڈھونڈ کر نکالو۔ اگر وہاں ملے تو ایک اس کو کھینچ کر لائے یہاں اور ایک اس کے لیے وہاں قبر کھودے......" یہ کہہ کر انہوں نے چادر نیچے زمین پر پھینکی۔

سلطانہ آدے سر جھکائے زرک سے پوچھ رہی تھیں اور نغمہ اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں دکھ سا تھا۔ شاہ گل کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں شاہ گل، میں ایسا نہیں چاہتا تھا...... میں تو بس آپ کو بتانا چاہ رہا تھا۔" زرک شرمندگی سے معافی مانگ رہا تھا۔ شاہ گل خاموش کھڑے ہوئے اضطراب سے انگلیاں بھینچ رہی تھیں۔ ان کو زرک سے کوئی گلہ نہیں تھا، اس کی سچائی پر ان کو یقین تھا۔ بس آنے والا طوفان ان کے دل کی دھڑکن کو تیز کر رہا تھا۔

☆☆☆

"تم نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔" نغمہ کے لہجے میں اس کے لیے بے اعتباری تھی اور دکھ بھی

......اس کی بات پر پہلے زرک نے اس کو تڑپ کر دیکھا۔
"تم ایسا کہہ بھی کیسے سکتی ہو؟" وہ بے یقینی سے اس لڑکی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جس سے اس کو محبت تھی۔
"کیوں نہیں کہہ سکتی۔ پورے خاندان میں تم نے میرے بھائی کو بے عزت کر دیا۔ تم نے اس پر جھوٹا الزام اس لیے لگایا تھا کہ تم اس سے بچپن کی اس بات کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔" نغمہ بے دردی سے کہتی اس کے دل پر مزید ضربیں لگا رہی تھیں۔
"بچپن کا بدلہ؟......" اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا اب وہ بے یقینی کے بعد دکھ کی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ "تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو میرے لیے؟ میں بچپن کا بدلہ لے رہا تھا؟" اپنے سینے پر انگلی رکھ کر استفسار کر رہا تھا۔ "میں نے بہت سوچ سمجھ کر صرف شاہ گل سے بات کرنا چاہی تھی۔ لیکن اس وقت کاکاجی نکل آئے۔ اس میں میری غلطی نہیں تھی۔ اگر مجھے اس سے بچپن کا بدلہ لینا ہی تھا تو میں اس طرح نہ لیتا۔ میں اس کو پڑے رہنے دیتا اس تاریکی میں۔ وہ چرس پیتا اور تم لوگ بے خبر رہتے۔ لیکن میں نے اس کی بھلائی سوچی تھی نغمہ! آخری بات...... میں جھوٹ نہیں بولتا' اور اس چرس کی گواہی غفار حجام اور اشرف ماما بھی دے چکے ہیں...... صرف میں نے نہیں دیکھا ہوا ہے......" وہ اتنا کہہ کر تن فن کرتا وہاں سے چلا گیا۔
گھر آکر غصے میں اپنے کمرے جا گھسا اور دروازہ بند کر کے' چارپائی پر لیٹ کر' آنکھوں پر بازو رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔
اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نغمہ سے بات نہیں کرے گا۔ اگر اس کو اپنے بھائیوں کے دستار کی اتنی ہی فکر ہے' تو اس کو بھی اپنی محبت کے وقار کا خیال ہے......!
ساری رات وہ اس کی باتوں پر کڑھتا رہا۔ اگلے دن اس کا اسلامیہ کالج میں پہلا دن تھا اور اس کو بجر دم ہی اٹھنا تھا باڑہ کی بس کے لیے...... صبح نماز پڑھ کر وہ اپنے سفید کپڑے پہن کر' کتابیں لے کر روانہ ہوا۔ گھر سے نکلتے اس نے دیکھا کہ نغمہ پانی بھر رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں اور اس نے فوراً نظریں موڑ لیں۔ نغمہ اس کے پشت کو دیکھتی رہی۔ اس نے کل رات بہت برا کیا تھا۔ اس کو افسوس ہو رہا تھا اور اپنی غلطی کا احساس بھی۔

☆☆☆

جب وہ بس سے اترا تو گاؤں کے اسٹاپ پر' سہ پہر کی نارنجی روشنیاں پھیلی ہوئی تھی۔ گنے کے کھیتوں میں ایسا لگتا تھا کہ سارا گاؤں اکٹھا ہوا تھا۔ کوئی گنے کے گٹھڑیوں کو کندھوں پر اٹھائے جا رہا تھا اور کوئی پائندونوں (گنے کا اوپری حصہ' جو مویشیوں کو کھلایا جاتا ہے) کر رہے تھے۔ ان کے مزدوروں نے اس کو دیکھ کر سلام کیا تھا۔ وہ جواب دیتا آگے بڑھ گیا تھا۔ ان کے خاندان میں' بلکہ پورے گاؤں میں زرک پہلا لڑکا تھا جو پانچویں جماعت سے آگے پڑھ کر اب کالج بھی جانے لگا تھا۔
حبیب کاکا نے نیک احمد کو میاں صاحب کے مدرسے علیجو (گاؤں) بھیج دیا تھا۔ باقی دونوں بھائی اپنے کھیتوں کے کام دیکھنے لگے تھے۔ وہ ویسے بھی اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے۔
جیسے ہی وہ اپنے گھر پہنچا تو صحن میں بچھائی گئیں چارپائیوں پر بیٹھے' سہ پہر کی بچی کچھی دھوپ سینکتی مور جانہ کے سامنے برکت ماما بھی بیٹھے تھے۔ اس کے چہرے پر ایک خوبصورت دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ان کے پاس پہنچ کر گلے لگ گیا۔
"کتنے عرصے بعد دیکھا ہے بھئی اس کو ......اس کی تو مونچھیں بھی نکل آئیں اور یہ کیا تم نے حجامت بھی کرنی شروع کر دی گیا؟" اس کے چہرے کا بھرپور جائزہ لیتے برکت ماما (ماموں) اس سے پوچھ رہے تھے۔
"وہ خیرہ (خیر سے) اس کی حجامت کا حلوہ

پچھلے مہینے پکایا تھا......" مور جانہ بیٹے کو پیار سے دیکھتے ہوئے اپنے بھائی کو بتا رہی تھیں۔ (پرانے وقتوں میں لڑکے کی پہلی حجامت پر مائیں حلوہ پکاتی تھیں)

" مونچھیں تو چھوڑی ہیں ......لیکن میرے سامنے تاؤ مت دینا ورنہ میں کاٹ دوں گا۔" برکت ماما اس کو مصنوعی دھمکی دے رہے تھے۔ اس نے سنتے ہی تاؤ دیا اور برکت ماما نے 'شیطان' کہتے ہوئے اس کا کان پکڑا۔ وہ کراہنے لگا۔

" توبہ نیانہ کوم (پھر نہیں کروں گا)" اس بات پر برکت ماماجی نے فوراً اس کے کان چھوڑے تھے۔

" کہاں داخلہ لیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

" اسلامیہ کالج میں۔" اس نے جواب دیا۔

" وللہ......باقی کسی کو تو شوق نہیں۔ نہ ہی اس کے باپ نے کچھ کہا۔ کہہ رہے تھے کہ جو جی میں آئے کرے بس ایسے کام نہ کرے جس سے ان کے دستار کو خطرہ ہو۔" مور جانہ نے دونوں کے علم میں اضافہ کیا۔

" تعلیم سے دستار کو کبھی خطرہ نہیں ہو سکتا آپا ....بے فکر رہو زمازرک خان (میرا ازرک) کبھی ایسا کام نہیں کرے گا۔ اچھا تم بتاؤ۔ کس چیز میں داخلہ لیا ہے؟"

" آرٹس لیا ہے ماماجی۔"

" سائنس کیوں نہیں؟ ڈاکٹر نہیں بننا کیا؟"

مسکرا کر ان کی باتیں سنتے ہوئے مور جانہ کے چہرے پر مسکراہٹ غائب ہوئی۔ " وائی اللہ! تم ڈاٹنر (ڈاکٹر) نہیں بنو گے؟ میں تو ہر کسی کو کہتی ہوں کہ میرا بیٹا ڈاٹنر بنے گا۔" ان کا انداز ایسا تھا کہ جیسے بڑا دھچکا لگا ہو۔

" نہیں مور جانے۔ میں ڈاکٹر بنوں گا۔ لیکن کتابوں کا ڈاکٹر۔ انسانوں کا نہیں۔" وہ برکت ماما کے سوال کا جواب دے رہا تھا یعنی اس کو پی ایچ ڈی کرنا تھی۔

" تو پھر کیا فائدہ تمہارے پڑھنے کا' ہنہ۔" مور جانہ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اٹھی تھیں۔ " اچھا تم بیٹھو تھکے ہارے آئے ہو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا دوں۔"

ان کے انداز پر دونوں ماموں بھانجا ہنستے چلے گئے۔

☆☆☆

اور یہ اگلی جمعرات کا قصہ ہے۔

شام ابھی محو استراحت تھی اور وہ نماز پڑھ کر گھر آ رہا تھا۔ وہ ہر دن شام کو پڑھائی کرتا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنے کمرے جا رہا تھا۔ تو برآمدے کے ستون سے کسی نے اس کا بازو دبوچا اور اس کو سیڑھیوں کی اور کھینچا تھا۔ چوڑیاں ہلکی سی کھنکی تھیں اور پہلے تو وہ اس افتاد پر سنبھلا نہیں...... جب سنبھل چکا تو سمجھ بھی گیا۔ تیسری سیڑھی پر وہ رکا تھا۔ اوپر چڑھتی نغمہ بھی رکی تھی۔

" گلے کرنے ہو یا خفگی میں منہ بسورنا...... اوپر آ کر شرافت سے کرو......" نغمہ کے لہجے میں بیک وقت دلربائی بھی تھی، تنبیہ بھی اور التجا بھی...... اس نے پہلے شام کی نیلگوں روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی ناک میں باریک چاندنی جیسی نتھ چمک رہی تھی۔ وہ سپاٹ چہرہ پر سنجیدگی سجائے' لیکن دل میں مسکراہٹ دبائے اوپر چڑھنے لگا۔

" کہو...... کیا کہنا ہے......" سینے پر ہاتھ باندھ کر وہ چہرہ موڑے پوچھ رہا تھا۔

" پہلے آنکھوں میں دیکھو۔" اس کے سامنے کھڑی نغمہ کہہ رہی تھی۔

" ان آنکھوں میں؟ جن میں کچھ دن پہلے میرے لیے بے یقینی تھی؟" خفگی میں طنز ملاقات کا حسن بڑھا دیتا ہے۔

" تم دیکھو تو سہی......" وہ منمنائی۔

" نہیں دیکھنا......کام کی بات پر آؤ...... نیلی آنکھوں والے لوگ دروغ گو (جھوٹے) اور ساحر ہوتے ہیں۔" اس کی زبان پر ایسے جملے کیوں مچل رہے تھے' اس کو خود بھی حیرت ہونے لگی تھی۔ اس کا

دل تو اتنا بے قرار تھا' اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے لیے......اور اس کا کتابی چہرہ دیکھنے کے لیے......

''تم اب بھی خفا ہو؟'' وہ اب روہانسی ہو کر پوچھنے لگی۔ ''دیکھو تم نے کہا تھا کہ گلاب تمہارے بالوں میں سجاؤں گا۔ دیکھو میں لائی ہوں گلاب۔ میری ہتھیلی کو دیکھو۔'' اس نے ہتھیلی پھیلائی۔ نا چاہتے ہوئے بھی زرک نے ترچھی نظروں سے اس کی ہتھیلی کو دیکھا تھا اور اگلے ہی پل نغمہ نے اس کی چوری پکڑ لی اور ہنسنے لگی۔ ایک دفعہ پھر سے وہ اس کو بے وقوف بنا گئی۔

وہ خفا ہوتا مڑ کر جانے لگا کہ ایسے میں نغمہ نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ پھیلایا اس کے عین سامنے......اس میں گلاب تھا......

''منانے آگئی ہوں۔ مان جاؤ۔'' وہ دوسرے ہاتھ سے کان پکڑے کہہ رہی تھی اور اس کے انداز پر وہ پگھل گیا۔ کچھ دیر وہ کھڑا اس کو خفگی سے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرایا اور اس کے ہتھیلی سے گلاب اٹھا کر اس کے بالوں میں کان کی پیچھے سجانے لگا۔

''دنیا ایک طرف ہو میرے خلاف، تمہیں دوسری طرف کھڑے ہو کر میرا ساتھ دینا چاہیے' نغمہ!'' اب اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہہ رہا تھا۔

''تم اب ایسی ملاقاتوں میں فلسفے بگھارو گے؟'' اس نے منہ بسورا۔

''تو شاعری کروں کیا۔'' وہ ہنسا تھا۔

''ہاں......شاعری سناؤ۔'' اس کے مذاق میں کہی گئی بات کا امتحان بناتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ پہلے تو وہ ٹپٹا گیا......ایسے موقع پر دماغ کے سارے خانوں پر قفل لگ جاتا ہے۔ پھر اچانک صبح پشتو کے ٹیچر کے لیکچر کے دوران کہے گئے غزل کے شعر یاد آئے......وہ مسکرایا اور کھنکار کر گلا صاف کیا۔

''جانانہ سترگو پہ سترگو کی می گورہ

(جاناں! آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھو)

چہ درتہ اوخکاری دہ جپل

(کہ تمہیں دکھے تمہارے

دہ جپل جبیں خالونہ''

(تمہارے ماتھے کی بندیا)''

اسی سے' نغمہ نے دیکھا محبت کا دیکھنا کیسا دیکھنا ہوتا ہے......اس کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوئیں اور گال دہک کر لال ہو گئے۔ زرک کی پار ہوتی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے' وہ فوراً مڑی اور نیچے جانے لگی......

وہ ہنسا تھا......''رکو تو......ڈرپوک......!''

☆☆☆

اسلامیہ کالج کی تاریخی عمارت پر سرما کی دھوپ سرک رہی تھی۔ سردیوں میں وہ سفید یونیفارم پر' کالی شیروانی پہنتے تھے۔ اس وقت وہ شیروانی پہنے دھوپ سینکتے اتنا کنڑی کھیل رہے تھے۔ اس کے پاس ٹپوں اور غزلوں کی ایک بہتات تھی۔ جیسے ہی جملہ ختم ہوتا' وہ آخری حرف پر فوراً ہی غزل سنانے لگتا......اور وہ زیادہ تر غنی خان بابا کی غزلیں ہوتیں......

کلاس کا ٹائم ہو گیا تھا۔

وہ اپنے سوات کے دوست کے ساتھ اب کلاس کی طرف جا رہا تھا۔

''تمہارا حافظہ بہت اچھا ہے زرک خان اور ذوق بھی......'' سوات کا سنگر یار اس کی تعریف کر رہا تھا۔ ''کہاں سے پڑھا ہے اتنا سب کچھ؟''

وہ مسکرایا اور......چمکتی دھوپ میں آنکھیں چندھیاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

''میرا ماما ہے......چارسدہ اتمان زئی میں۔ ان کے پاس ٹیپ ریکارڈ ہے اور اتنے سارے کیسٹس۔ جب بھی جاتا تھا میں ان کے ہاں تو ان کا ریڈیو ہر وقت بجتا تھا اور نا چاہتے ہوئے بھی میں سنتا تھا......تو ایسے بہت ساری غزلیں حفظ ہو گئیں۔'' اس نے تفصیل سے بتایا تھا۔

''تمہاری لکھائی بھی بہت اچھی ہے......بالکل خطاطوں والی......'' سنگر یار بہت متاثر معلوم ہوتا تھا

''نہیں یار۔ اب اتنی بھی نہیں۔''

"آرٹ کے اور کون سے شعبوں سے زیادہ شغف ہے؟"

"بس کچھ خاص نہیں ......" بچپن کا ایک تلخ واقعہ اس کے حلق میں کسی کانٹے کی طرح آن پھنسا تھا۔

"میں مان نہیں سکتا۔ اس دن تم تاریخ کی کتاب پڑھ رہے تھے لائبریری میں۔ اور کئی دن سے میں تمہیں نوٹ کرتا ہوں تم مجسمہ سازی کے ہی صفحات پڑھتے ہو اور مشہور مجسمہ سازوں کے مجسمے دیکھتے ہو۔"

وہ مسکرایا۔ "لگتا ہے تم میری جاسوسی کرتے ہو۔"

"نہیں۔ بس وہ تمہاری محویت مجھے دیکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ اب بتاؤ بھی۔ اس میں کیا ہے؟ مجھے افسانے لکھنے پسند ہیں۔ چند افسانے لکھے تھے پھر ڈرتے ڈرتے پشتو ڈیپارٹمنٹ کے مقصود صاحب کے پاس لے گیا۔ وہ جتنے بڑے لکھاری، شاعر اور مجسمہ ساز ہیں اتنے ہی اچھے اور بڑے دل والے انسان بھی —— اتنی عجز و انکساری میں نے کسی میں آج تک نہیں دیکھی۔"

"تو وہ پڑھ کر رائے دیتے تھے؟" وہ اب تجسس سے اس کی اور متوجہ ہوا۔

"ان کا بڑا پیارا انداز ہے۔ پڑھ کر پوچھتے ہیں کہ افسانے کی پہلے اچھی بات بتاؤں یا بری؟ میں کہتا ہوں کہ اچھی ...... کہتے ہیں کہ پہلی بری بات بتاتا ہوں کہ کڑوی چیز کے بعد میٹھی چیز کھاؤ تو کڑواہٹ دور ہو جاتی ہے۔" سنگریار ہنسا تھا۔

"انہیں مجسمہ سازی پر ..... مصوری پر ..... کوئی کچھ نہیں کہتا؟" وہ رک کر اس سے پوچھنے لگا۔

"کیا مطلب کوئی کچھ کیوں کہے گا۔"

"میرا مطلب ...... لوگ مانتے ہیں کہ یہ گناہ ہے۔"

"یار! اس بارے میں میرا علم صفر ہے۔ نیم ملا، خطرہ ایمان کے تحت میں چپ رہنا بہتر سمجھوں گا۔ اس موضوع پر ...... کیوں نا تم بھی میرے ساتھ چلو اگلی دفعہ ......" سنگریار کا لہجہ بہت نرم اور معصومیت سے بھرپور ہوتا تھا۔

"وہ برا مان جائیں گے۔" وہ سر نفی میں ہلانے لگا۔ درحقیقت وہ سنگر سے یقین دہانی چاہتا تھا کہ وہ کچھ نہیں کہیں گے۔

"وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ بہت اچھے ہیں بھئی۔" سنگر نے مسکرا کر اس کے شانوں پر ہاتھ مارا اور وہ مسکرایا۔ اتنے عرصے بعد اس کے اندر شوق کی آگ کو چنگاری ملی تھی۔

☆☆☆

پھر میں وہ سنگریار کے ہاسٹل پہنچ گیا وہ مقصود صاحب کے گھر گئے۔ انہیں دیکھ کر مقصود صاحب کے چہرے پر ایک مہرباں مسکراہٹ پھیلی۔ "ایک اور آرٹسٹ؟ یا صرف دوست؟"

وہ سنگر سے مسکرا کر پوچھ رہے تھے۔ سنگر بھی ہنس پڑا۔ "سر جی! یہ متجسس آرٹسٹ ہے۔ کچھ سوال پوچھنے آیا ہے۔"

"آؤ ......!" مقصود صاحب کی تقلید میں وہ دونوں گھر میں داخل ہوئے۔ ایک راہداری میں سے گزر کر وہ گھر کی پیچھے ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں آئے۔ سنگر باہر لان میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ وہ مقصود صاحب کا اسٹوڈیو تھا۔

اسٹوڈیو بے ترتیب تھا۔ کہیں ہائڈروکال کی بالٹی پڑی تھی، ووڈ تنگ ٹولز، اسکریپرز۔ وہ جوان چیزوں کے نام تک نہیں جانتا تھا۔

"سامنے دیکھو ...... مٹی نظر آرہی ہے ناں گارے جیسی۔ اس کو کلے کہتے ہیں۔ جاؤ اور کچھ بنا کر دکھاؤ۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میں قدرتی صلاحیت ہے کہ نہیں۔" مقصود صاحب اس کو سامنے میز پر پڑے چار مختلف کلے کی اقسام کی طرف اشارہ کرکے بول رہے تھے۔

زرک نے گہری سانس بھری ...... اور اس وہاں جا کر چاروں کلے میں سے ایک کلے کا انتخاب

کیا اور ہاتھوں سے اسی چڑیا کا مجسمہ بنانا شروع کیا جو وہ اور تنمہ بچپن میں ایک ساتھ بناتے تھے۔ جب بنا چکا تو مقصود صاحب کو دکھایا۔ وہ کچھ دیر اس کو پکڑے خاموشی سے گھورتے رہے۔

''سب سے پہلے یہ بتاؤ' تم نے اس کلے کا انتخاب کیوں کیا؟''

''کیوں کہ یہ لچکیلی مٹی تھی۔''

''اور اس سے کیا ہوتا ہے اگر مٹی لچکیلی تھی' باقی بھی تو اسی طرح کی تھیں ناں؟''

''نہیں سر جی...... باقی اس طرح نہیں تھیں۔ یہ والی آسانی سے خشک نہیں ہوتی' اس لیے اس کو دوبارہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ باقی میں پانی استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔''

''ہم۔'' مقصود صاحب نے لمبا ہنکارا ابھرا۔ ''تمہاری بات ٹھیک ہے بیٹا۔ یہ کلے جو تم نے استعمال کی' اس کو waxy clay or oil based clay کہا جاتا ہے اور یہ جلدی سوکھتا نہیں اور دوبارہ استعمال کیا جا سکتا ہے......'' پھر انہوں نے چڑیا کو دیکھا۔ ''اور یہ...... تمہارے ہاتھوں میں فن ہے' قدرتی فن...... اس کو تراش کی ضرورت ہے' اور اس فن کے ہیرے کو تراشنے کا جوہری کون ہے' یہ بھی بتا دوں گا...... لیکن اس سے پہلے تم مجھے یہ بتاؤ' تم کس تجسس اور کون سا سوال پوچھنے آئے ہو۔ تمہاری آنکھیں مضطرب دکھ رہی ہیں۔''

''سر! بچپن میں' میں تصاویر بناتا تھا۔ ان تصاویر پر مجھے قاری صاحب نے پیٹا اور ملعون کہا۔ کیا مجسمے بنانا گناہ ہے یا یہ آرٹ ہے۔''

''سو یہ تجسس نہیں...... کنفیوژن ہے۔'' مقصود صاحب مسکرائے اور اپنی کرسی سے اٹھے۔ ''خیر' اس موضوع پر بات کرنے سے پہلے میں تمہیں پہلے یہ واضح کر دیتا ہوں کہ ہاں یہ آرٹ ہے اور ہاں یہ گناہ ہے۔ اسلام میں اس کی ممانعت ہے۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا فرمان ہے کہ 'جو شخص مجسمہ تراشے گا' قیامت کے دن اللہ اس سے مطالبہ کرے گا کہ اپنے تراشیدہ مجسمے میں روح پھونک دے اور وہ اس کام میں عاجز اور ناکام ہوگا...... ایک دوسری روایت بھی ہے کہ 'جو شخص بھی مجسمہ تراشی کرے گا مانو اس نے اللہ سے جنگ کی۔'

سو یہ پہلے جان جاؤ کہ یہ گناہ ہے' اب اگر یہی تمہارا سوال تھا تو اس کا جواب یہ ہے...... اور کوئی سوال؟''

''سر! لوگ مانتے ہیں کہ یہ ایک خدائی وصف ہے؟''

''ادھر آؤ' اس مجسمے کو دیکھو۔'' مقصود صاحب اپنے کام کا ایپرن پہن کر اب اسٹینڈ پر لگے کلے کے مجسمے کے خدوخال کو سنوار رہے تھے۔ ''انسان دو چیزوں سے بنا ہے۔ ایک جسم اور ایک روح۔ یہ دونوں مل کر بناتے ہیں نفس۔ ان دونوں کی جوڑی میں' جسم کی مثال ایک غلام اور روح کی مالک کی سی ہے۔ اور روح پھونکنے کا وصف صرف خدا کے پاس ہے...... اس لیے ہاں یہ ایک خدائی وصف ہے۔ خدا نے ہر انسان کو الگ الگ مٹی سا بنایا ہے' پھر اس کا سانچہ (جسم) اس میں روح پھونکی ہے...... اور یہی وصف ہم مجسمہ سازوں کے پاس نہیں ہے۔ اسی طرح یہ خدا کے وصف کی برابری کی ایک نقل ہی اور کسی حد تک شرک میں حساب ہوتا ہے۔''

''سر! اگر ہم کسی اہم شخصیت کا فرضی مجسمہ بنائیں' تو کیا یہ بھی ممنوع ہے؟ کیونکہ اس شخصیت کا تو سب کو معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی ہم اس میں روح ڈالتے ہیں۔'' وہ اپنا نچلا لب اضطراب میں کاٹ رہا تھا' یوں جیسے اس کو اپنے من پسند جواب سننے کی جلدی تھی۔

''اس کے دو جوابات ہیں' پہلا آج کے زمانے کے مطابق' جہاں آرٹ کو مذہب کے متعین کیے گئے پیمانوں میں نہیں ناپا جاتا...... تو ہاں' آرٹ کی یہ قسم کافی مقبول اور کافی عرصے سے استعمال ہو رہی ہے۔ اس کا دوسرا جواب ہے کہ اسلام کے رو سے نہیں۔ کیوں؟ یہ ایک واقعے سے سمجھاتا ہوں۔ تخ

مکہ کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کعبے گئے تو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ اسلام اور حضرت عیسی علیہ سلام کے مجسمے دیکھے جن کے ہاتھوں میں کاسے تھے۔ان کاسوں کے نام "ازلام" تھے۔تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ناراضی سے فرمایا کہ "اللہ ان مجسموں کے بنانے والوں کو ہلاک کردے۔خدا کی قسم! وہ بھی جانتے ہیں کہ ان دو پیغمبروں نے ایسا کام انجام نہیں دیا ہے۔" تو کسی مذہبی شخصیت کی' یا ایسے کسی عام شخص کا مجسمہ بنانا بھی صحیح نہیں مانا گیا اور پسند نہیں کیا گیا۔"

"سر! آج کے زمانے میں ہم اس کو پوجتے تو نہیں ہیں ناں۔" زرک کے ماتھے پر چند شکنیں تھیں یوں جیسے اپنے من پسند جواب نہ ملنے پر خفا ہو۔

"آج کے زمانے میں پوجنے کے لیے اور کئی خدا ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ماڈرن زمانے میں انسانوں سے زیادہ خدا پائے جاتے ہیں۔آج کے لوگ اللہ کے علاوہ بھی کئی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں' ۔طاقت' حرص' خود غرضی' شہرت' دولت' حوس' خوشی' کامیابی' انسان' رتبہ' دھوکہ' انا' قوم' نصب' اولاد ...... یہ سب ...... جو جو چیز آپ کو اللہ سے دور کردیتا ہے وہ آپ کا خدا بن جاتا ہے۔آپ اس کو پوجتے ہیں اس کے لیے ہر حد پار کردیتے ہیں۔"

"سر! آخری سوال...... آپ کو جب اتنا پتا ہے کہ پھر آپ مجسمہ سازی کیوں کرتے ہیں؟" پھر سے زرک نے لب کاٹے۔

"اللہ نے انسان کے جسم اور روح کی باگ نفس کو تھمائی ہے۔نفس اس چیز کی طرف بہت مائل ہوتا ہے جس میں آپ کو دلکشی دکھے ...... اور یہ دلکشی بھی بطور امتحان رکھی گئی ہے۔سو میرا یہ شوق نفس کا تابع ہے۔جیسے ہم سب کو پتا ہے کہ گانا سننا گناہ ہے لیکن ہر کوئی یہ بات جان کر بھی سنتا ہے......"

"لیکن آج کا دور تو ماڈرن ہے' اس کو کوئی برا نہیں مانتا...... سبھی یہی کرتے ہیں...... نئے زمانے کی چال پر چلنا۔اس کو پیشہ بناتے ہیں۔جب میری اس صلاحیت سے اکسی انسان کو کوئی ضرر نہیں پہنچ رہا تو میں اس کو کیوں نا اپناؤں؟"

اس کے دونوں ابروؤں کے بیچ ایک الف سا کھنچ گیا۔آنکھوں میں شوق کی جوالا مکھی کی تپش پھوٹنے لگی۔بالٹی میں مکسنگ کرتے مقصود صاحب نے سر اٹھا کر اس کو دیکھا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"سو تم نے آرٹ اور مذہب کے بیچ ایک لکیر کھینچ دی ہے۔تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں اس جوہری کے بارے میں بتاؤں' جو تمہارے فن کو مزید تراشے؟"

☆☆☆

اس کی آنکھوں میں تپش تھی' اپنے شوق کی اور ہاتھ میں منزل کی چھٹی ...... جہاں اس نے اپنے فن کے ہیرے کو تراشنا تھا ...... نیشنل کالج آف آرٹس لاہور ......

چونکہ اس کے گھر میں اس کی تعلیم سے کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا اس لیے اس نے گھر میں محض اتنا بتایا تھا کہ اس کو لاہور جانا ہے۔سکندر یار ٹھیک کہتا تھا' اس کو کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ کیا پڑھنے جا رہا ہے۔صرف مور جانے کو بتایا تو ان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خوف کی پرچھائی گزری تھی۔

"اگر تمہارے باپ کو پتا چلا تو؟"

"انہیں پتا نہیں چلے گا' زما خوا گے مورے (میری پیاری ماں)!"

اس کے ایف اے کے پرچے ہونے میں ابھی وقت تھا۔اس دوران اس کے بڑے بھائیوں عباس لالہ اور جمیل کے رشتے طے کردیے تھے بخت الرحمن کاکا کی بیٹیوں کے ساتھ اور اس کی دونوں بہنوں کے رشتے ان کے دونوں بیٹوں کے ساتھ ...... شاہ گل تو باقاعدہ خفا ہو بیٹھیں کہ وہ نیک احمد اور لیاس خان کے لیے اس کی بہنوں کا سوچے بیٹھی تھیں ...... مور جانے نے ان کے ہاتھ پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا تھا۔

"دیکھو شمیے! انہوں نے پہلے بات کر دی تھی۔ میں ان کو انکار نہیں کر سکتی تھیں ناں۔ تم پہلے رشتہ ڈالتیں تو میں تمہیں فوراً ہاں کر دیتی۔ جیسے تمہارے بچے مجھے عزیز ہیں' اس طرح عابدے کے بھی ہیں...... لیکن میرا زرک خان ہیں ناں ابھی...... اس کے لیے میں تم سے نغمہ کا کہہ رہی ہوں۔ رشتے کے لیے پورے روایت کے ساتھ آؤں گی لیکن ابھی سے تمہارے کان میں بات ڈال دی ہے......"

شاہ گل پہلے تو خاموش رہیں لیکن جب حبیب الرحمٰن کاکا کی طرف سے کوئی اعتراض نہ اٹھا تو انہوں نے مورجانہ کو عندیہ دے دیا۔ جمعے کی چھٹی پر جب نیک احمد آیا تو اس کی آنکھوں میں اس فیصلے پر تپش تھی۔

"زرک اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم چپ رہو۔ اپنا بغض اپنے دل میں دبا دو' منہ پر لانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے فیصلے کرنے والے ابھی زندہ ہیں۔ مدرسے نے تمہیں ذرا بھی نہیں بدلا ہے' محض نام کی ڈاڑھی چھوڑی ہے اور دین پڑھ رہے ہو؟" اس کی بات پر شاہ گل آگ بگولا ہو گئیں۔ ان کو زرک ویسے بھی پسند تھا۔

ان کی بات پر وہ خاموش رہا لیکن اندر غصے کی آگ جلتی رہی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ عباس اور نبیل کی شادی میں نہیں ہوگا اگر وہ لوگ تماشے (گانا بجانا' رقص) کریں گے۔ اعتراض تو نیا نیا تبلیغ میں چار ماہ لگا کر آچکے رستم اور حبیب الرحمٰن نے بھی کیا لیکن وہ مہمانوں کے لیے چپ رہے اور کچھ نہ بولے......

"اس شادی میں تمہاری اور نغمہ کی منگنی بھی ہو گی۔" کتاب پر جھکے زرک کو مورجانے اپنے تئیں خوش خبری سنا کر مسکرا رہی تھیں۔ کتاب سے سر اٹھا کر جب زرک نے دیکھا تو اس کا چہرہ اس خبر پر بجھا ہوا تھا۔

"کیا فائدہ!" اس نے رخ موڑ کر کہا۔ اس کی بات پر مورجانے کا چہرہ متغیر سا ہو گیا۔ "نکاح پڑھوا دیتیں سیدھا۔" کتاب میں سر رکھ کر شرمانے کی مصنوعی ایکٹنگ کرنے لگا۔

مورجانہ اس کے کمر میں ایک دھموکہ جڑ دیا۔

"مشروٹ (شریر)......!"

☆☆☆

عباس لالہ اور نبیل کی مہندی کا سلسلہ شروع ہوا' خاندان بھر سے کوئی نہ کوئی ان کے لیے مہندی لے کر آتا تھا۔ یہ دو ہفتے لگاتار عورتیں رات کو دولہوں کو مہندی لگاتیں اور تماشے کرتیں...... جب شادی کا ہفتہ شروع ہوا تو پورے خاندان میں ہر گھر میں مہندی پہنچائی گئی (ایک پرانی رسم)۔ وہ کسی کام کے سلسلے نغمہ کے گھر گیا تو نغمہ ان کے گھر سے آئی مہندی میں پانی ڈال کر بھگو رہی تھی۔ اس کو آتا دیکھ اس نے فوراً دوپٹا ٹھیک کیا اور مہندی کو وہیں چھوڑ کر برآمدے کی اور دوڑ لگائی...... ان کی چھانکا تائی سے حقہ اٹھاتے ہوئے سلطانہ آدے مسکرائی تھیں۔

"وائی اللہ توبہ! لگتا ہی نہیں کہ یہ دونوں بچپن کے دوست ہیں جو سارا دن بڑ کے نیچے شیطانیاں کیا کرتے تھے...... اب دیکھو' تمہیں آتا دیکھ کر شرم کے مارے بھاگ کھڑی ہوئی......"

"آدے! مورجانے نے کہا ہے کہ یہ ہفتہ آپ ہمارے گھر گزاریں گی۔ غٹہ آدے (بڑی دادی) کے بعد آپ ہی ہماری سربراہ ہیں۔" وہ ان کے ساتھ بیٹھا تو انہوں نے ماتھا چوما تھا۔

"وائی زار! بس آتی ہوں شام کو...... ان شاء اللہ۔ تم آجانا مجھے لینے......" آدے نے مسکرا کر کہا پھر اس کو دیکھ کر مسکراہٹ دبا کر اشارہ کیا کہ اب دیکھو۔ "نغمے! بچے جلدی آؤ مہندی میں مرغیاں چونچیں مار رہی ہیں...... زرک خان چلا گیا۔"

ان کی آواز پر جیسے ہی باہر آئی سامنے دادی اور وہ مسکراہٹ روکے اس کو دیکھ رہے تھے۔ شرم کے مارے اس کا چہرہ فوراً سرخ ہوا تھا اور واپس دوڑی تھی۔ دونوں نے ایک دلکش قہقہہ لگایا۔

"شرما گئی۔" دادی قہقہے لگاتیں تو کھانسی بھی

ساتھ ساتھ چلتی۔

"اچھا آدے، میں چلتا ہوں......شام کو لینے آؤں گا۔" اس نے تیز آواز میں کہا' درحقیقت وہ اس کو سنانا چاہتا تھا۔ اپنے کمرے میں کھڑی پھولی ہوئی سانسوں اور بے ربط دھڑکنوں کے ساتھ اس نے منتقمانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائی اور بڑبڑائی......

"دیکھو، اب میں تم سے کیسا بدلہ لیتی ہوں۔"

دونوں بے صبری سے آسمان کے کنارے شفق کے سیاہی میں تبدیل ہونے کا انتظار کرتے رہے......جیسے ہی شام نے پر پھیلائے' اسی وقت دونوں اپنی مخصوص جگہ پر کھڑے تھے۔ گھر کے پیچھے بڑ کے درخت کے پاس......

"مہندی کہاں کی تھی؟" اس کا پہلا سوال کتنا غیر معمولی تھا۔

"کیا مطلب......چارسدہ سے لائے ہیں برکت ماما......جلدی اور بہت چوکھا رنگ چھوڑتی ہے......" اس نے اترا کر کہا تھا۔ "تم پوچھ کیوں رہی ہو ویسے......؟"

اس کے سوال کے جواب میں ایک دم سے نغمہ نے تازہ مہندی اس کے چہرے پر لکیر کی صورت لگادی۔

"اس لیے......بڑے شوخے بن رہے تھے ناں؟ اب جلدی ہی چوکھا رنگ بھی چھوڑے گی......"

"وہ آدے کا مذاق تھا۔" وہ ششدر کھڑا اس کو کھ رہا تھا۔

"اور یہ میرا......" پھر اس نے پیچھے سے مہندی سے بھرا آب خورہ اس کے سامنے کیا۔ "دیکھو سب مہندی لگا چکے ہیں۔ میں نے تمہارا انتظار کیا۔ تم نے کہا تھا ناں کہ مہندی تم لگاؤ گے۔"

نغمہ کی چالاکی پر وہ مسکرایا۔ "زخم دے کر مرہم بھی ساتھ رکھتی ہو؟"

"شادی کے بعد نمک رکھا کروں گی مرہم کی جگہ......" وہ کھلکھلائی۔

وہ بھی مسکرایا۔ نغمہ نے ہاتھ آگے کیے اور اس نے بہت محبت اس کے پورے ہاتھوں پر مہندی لگائی۔ اس کے دودھیا ہاتھ' سرخ مہندی میں رچے کتنے حسین دکھائی دیں گے۔ وہ سوچ کر مسکرایا تھا۔

☆☆☆

مہندی کی رات اس کی زندگی میں آنے والی سب سے حسین رات تھی۔ اس رات اس کی منگنی تھی۔ منگنی تو خیر صرف نام کی تھی۔ بس پورے خاندان کے سامنے شاہ گل کو زرک کو انگوٹھی پہنانی تھی اور مور جانے کو نغمہ کو......

وہ اپنے کمرے میں کھڑا' اپنے کپڑوں کے انتظار میں تھا۔ ایسے میں ایک لڑکی داخل ہوئی' جس کے کپڑے عام سے تھے لیکن چہرہ صاف و شفاف......وہ جتنی خوب صورت تھی' اس کا حلیہ بھی اتنا ہی عام سا تھا۔

"زرک لالہ......یہ طلعتو باجی نے بھیجے ہیں۔" اس نے چارپائی کے سرے پر اس کے استری شدہ کپڑے رکھے اور فوراً مڑی تھی۔ وہ اس سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔

"ستو......تم قاسم کی بہن ہو؟" وہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا' جب ناکام رہا تو پوچھ بیٹھا۔

لڑکی نے پیچھے مڑ کر پہلی بار اس سے نظریں ملائیں۔ "آوجی۔ (ہاں جی)"

اس نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔ قاسم کے ساتھ اس کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ جب وہ اتمان زئی جاتا تھا برکت ماما کے گھر تو اکثر اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ قاسم ایک سادہ مزاج کا بہت نرم دل انسان تھا۔

کپڑے پہن کر باہر نکلا تو صحن میں عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ سیدھا باہر نکلا اور حجرے چلا گیا۔ حجرے میں ٹنگ ٹکور (موسیقی کی محفل) جمی ہوئی تھی اور مغنیوں کے ساتھ برکت ماما بھی بیٹھا پورے جوش و خروش سے ٹپے گا رہے تھے......وہ قاسم کے ساتھ بیٹھ کر اس کے حال احوال پوچھنے لگے۔

"لگتا ہے عباس سے زیادہ اس کو جلدی ہے۔"

اس کی خالہ زاد نے کہا تو باقی سب بھی قہقہے لگانے لگے۔ دروازے کے قریب اس کی سب کزنز کھڑی تھیں۔ سب لڑکیاں اس کی ٹانگیں کھینچ رہی تھیں۔ وہ حاضر جواب تھا اور اس کے جوابات ان کو محظوظ کرتے تھے۔ اس کی نظریں نغمہ کو ڈھونڈتی رہیں لیکن وہ شرم کے مارے کہیں چھپی ہوئی تھی۔

مہندی میں شاہ گل نے اس کو سونے کی انگوٹھی پہنائی' جو بعد میں مور جانے نے اس سے لے لی تھی۔ پھر اس کو وہ دکھ گئی۔ رقص کے دائرے میں۔ اس کے بعد پوری شادی میں وہ اس سے چھپتی رہی۔

شادی کے بعد جب دریہ (دلہن کا میکے جانا اور ان کا دلہے کے گھر والوں کو دعوت دینا) ہو چکا تو وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے بس گھر میں اتنا کہا تھا کہ وہ پڑھنے جا رہا ہے۔ اور بس۔ دل تو چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے وہ نغمہ سے ملے لیکن نیک احمد چھٹی پر گھر آیا تھا۔ اس لیے اس نے مناسب نہ سمجھا اس سے چھپ کر ملنا......!

☆☆☆

لاہور اس کے لیے نیا تھا۔ یوں وہ یہاں اسلام پورہ' مقصود صاحب کے ایک جاننے والے کے گھر میں پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتا تھا۔ ان کا گھر پرانے طرز کا تھا۔

صبح ہوتی تو نیچے اس کے جاگ جانے کے بعد کہیں شور اٹھتا۔ دروازہ کھٹکھٹاتا دودھ والا' باہر گلی کے چوبارے پر بنی چوہدری صدام کی دہی کی دکان پر رش۔ اس کے لیے یہ سب نیا تھا۔ وہ پشاور کے ایک گاؤں کا رہنے والا' زندہ دلوں کے شہر لاہور میں آنکھیں کھول رہا تھا۔

جب وہ این سی اے پہنچا' تو این سی اے کے ماتھے پر ستمبر کے سورج کی روشنیاں پڑ رہی تھیں۔

ستمبر کی دھوپ میں تھوڑی بہت حدت تھی اور این سی اے کے اس پرانے عمارت کی بنیادوں میں وقت کی یادیں دفن تھیں۔ اس نے سوچا تھا کہ لاہور میں کتنے تاریخی عمارات ہیں' اس کو تو میوزیم میں سجا کر رکھنا چاہیے۔ پھر خود ہی اپنی بات پر ہنس کر کے کالج کا مین گیٹ کراس کر کے اندر داخل ہو گیا۔

کالج میں داخل ہوتے ہوئے' اس کی نظروں میں حیرت' خوشی' ستائش اور جوش کے کئی رنگ تھے۔ وہ پورا کالج گھوم رہا تھا۔ سر اٹھائے' سر گھماتے' رک رک کر ٹھٹک کر۔ جھولے پر بیٹھا بوسہ دیتے کپل کا مجسمہ' آرکیٹکچر ڈیپارٹمنٹ میں گول دائرے میں کے خم کھا کر کھڑا davidl کا مجسمہ' محرابی رنگین کھڑکیاں' پرانے سرخ اینٹوں سے سجی دیواریں' بوڑھے چھتنار درخت' دو رخ میں بٹی سیڑھیاں......

اس کے لیے یہ حیرت کدہ تھا' اس کے خوابوں کی دنیا...... بچپن سے اس نے اپنے اندر کے شوق کو دفنائے رکھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید اس کی یہ شوق دفن ہو کر مٹی ہو جائے گا لیکن وہ بھول چکا تھا کہ شوق جب دفنا دیا جائے تو وہ مٹی نہیں بنتا...... وہ جوالا مکھی (آتش فشاں) بن جاتا ہے...... جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا' اس میں انگارے نہیں تھے...... گارا تھا...... تازہ' خوشبودار گارا...... اس نے اپنے ہاتھوں کو سونگھا اور ایک تسکین اس کی روح کو پہنچی' سامنے اسٹول پر اس کی تخلیق کی پہلی صورت بن رہی تھی۔

☆☆☆

سلطانہ آدے کا انتقال ہو گیا۔ وہ ان کا رسم قل ادا کر کے' وہ ایک ہفتے وہاں گزار کر واپس لاہور جا رہا تھا۔ آتے وقت وہ بڑے قبرستان میں آدے کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تو آنسوؤں کے جھرنوں کو وہ روک نہ پایا تھا۔ جب جب وہ کسی مشکل میں ہوتا' مور جانے سے پہلے وہ آدے کے مہربان گود میں سکون ڈھونڈتا تھا...... وہ اس کی ڈھال تھیں' ہر کسی سے اس کو بچاتیں۔ لوگوں کی زبانوں پر ان کے کردار کے لیے اچھے الفاظ نہ تھے' لیکن جاتے وقت سب کو رلا کر گئیں

UUNovels.com

لاہور پہنچ کر اس کی حالت بدل گئی تھی اور یہ اس کی کلاس فیلوز نے بھی نوٹ کیا تھا کہ اب وہ خاموش رہنے لگا ہے پھر اس نے اپنی ساری توجہ اپنے کام میں لگادی۔ اس کی پینٹنگ اور مجسموں کی تعریفیں تعریف بھی ہوتی...... کیونکہ وہ اپنی جڑیں نہیں بھولا تھا' وہ ہمیشہ اپنے علاقے' اپنے رسم و رواج اپنی ثقافت سے انسپائریشن لیتا تھا......

اس کا پہلا باقاعدہ مجسمہ' جو ڈسپلے ہوا تھا وہ "میموسے" کا تھا۔ پشتو کے ایک لوک داستان کا مرکزی کردار' جس کو اس کے شوہر نے اس غیرت کے نام پر ذبح کیا تھا۔ اس نے اس مجسمے کا نام "میموسے" ہی رہنے دیا...... زمین پر اوندھی لیٹی ایک لڑکی' جس کے سر پر دوپٹا تھا اور ایک لٹ اس کی آنکھوں پر سایہ فگن تھی۔ اسی آنکھ سے ایک آنسو کی لکیر اس کے چہرے پر بہہ رہی تھی۔

ڈسپلے میں اس کے مجسمے کی کافی تعریفیں ہوئیں' لوگ تجسس کے مارے اس مجسمے کے سامنے کھڑے ہوتے تو کہانی سننے کی فرمائش کرتے اور پوری کہانی جان کر ان کا دل بنا روح کے مجسمے کے لیے دکھ سے بھر جاتا اور مجسمہ ساز کے لیے ستائش سے......!!

وہ بہت خوش تھا' اس کے فن میں نکھار بھی آیا اور انفرادیت بھی...... لیکن اس کو یہ نہیں پتا تھا کہ کل صبح اس کے مجسمے کے سامنے کوئی کھڑا اس کو شعلہ بار نظروں سے دیکھ رہا ہوگا...... اس شخص کی نظروں میں نفرت تھی' اس کے لیے...... اس مجسمے کے لیے......

"یہ آپ کے خان صاحب کا فن پارہ ہے' اور بھی ہیں کمال کے مجسمے۔ آپ دیکھنا چاہیں گے؟" اس شخص کو زرک کا کلاس فیلو خیام بہت جوش و خروش سے بتا رہا تھا۔

"نہیں...... مجھے اس "صنم تراش" سے ملنا ہے......"

نیک احمد نے گردن گھما کر خیام کو دیکھا تو اس کے مسکراتے ہونٹ سکڑ گئے۔ مہمان کے چہرے پر از حد کرختگی تھی۔

☆☆☆

رات کی تاریکیاں چہار سو پھیلی تھی۔ رستم خان کے کمرے کے اندر ہجوم اکٹھا تھا۔ فاطمہ (عباس کی بیوی) کے ہاتھ میں ٹرے قہوے کے فنجانوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی' اندر جمع لوگوں میں ایک ایک کے سامنے رکھ کر قہوہ پیش کیا...... رستم خان نے اس کو سر ہلا کر انکار کیا تھا۔

"نسوار می واچول (نسوار ڈال لیا ہے)......" ان کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی تھی۔

یہ سب آج ایک اہم فیصلے کے لیے جمع تھے۔

مور جانہ کی طبیعت آج کل کافی خراب رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ انہیں یرقان ہے' تب سے انہوں نے یہ ضد لگائی تھی کہ ان کی زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں' وہ اپنی زندگی میں زرک کی شادی ہوتی دیکھنا چاہتی ہیں!

"ان کو تھوڑا وقت دیتے ہیں ناں......" عباس لالہ نے کہا تھا۔ "ایک تو اچانک شادی...... اور......"

"نہیں بیٹا...... ہماری فکر مت کرو' ہماری طرف سے ساری تیاریاں مکمل ہے۔ اکلوتی بیٹی ہے میری' بچپن سے اس کا جہیز بنا رہی ہوں......" اپنی آخری بات پر خود ہی شاہ گل ہنس پڑیں۔

"بس ہماری بھی تیاریاں مکمل ہی سمجھو' زیور میں کب کا بنا چکی ہوں اور باقی کام تو ویسے بھی شادی کے دنوں کے ہی کرنے کے ہوتے ہیں۔" مور جانہ کے زرد چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ان کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان میں بہت توانائی آچکی ہو۔

"تو ٹھیک ہے' کل ماشاءاللہ سے نیک احمد رائیونڈ اجتماع کے لیے جا رہا ہے۔ آتے وقت زرک سے بھی اس کے کالج میں مل لے گا...... کہ ہم نے نیٹہ (تاریخ) رکھ دیا ہے......" حبیب الرحمن کے لہجے میں اب نیک احمد کے لیے فخر ہی فخر سا تھا۔ نیک احمد نے میاں صاحب کے مدرسے سے حفظ کیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی کافی سنی جاتی تھی۔ پانچ وقت کا نمازی'

تبلیغی اور حافظ۔

اگلے دن یہ خبر پورے خاندان میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ زرک کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی ہے۔ جو لوگ اس کو افواہ سمجھ رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ ان کے گھر سارے مرد اکٹھے ہو کے لکڑیاں کاٹ رہے تھے تو انہیں یقین ہو گیا۔ چارسدہ سے برکت ماما جی بھی آ چکے تھے۔ وہ ویسے بھی اکیلے تھے ان کا بھیتہ اپنے گھر گزارنا یا یہاں گزارنا ایک ہی برابر تھا۔

نیک احمد رائیونڈ سے واپس آیا تو اس کا چہرہ بدل چکا تھا۔ چہرے اور آنکھوں سے کرختگی جھلکتی تھی۔ گھر آنے کے بعد اتنے لمبے سفر کرنے کے باوجود وہ سیدھا مسجد گیا تھا۔ اس کو امام صاحب سے ملنا تھا۔

مسجد کے ایک کونے میں امام صاحب کے لیے ایک کمرا مختص تھا۔ چھوٹا سا کمرا، جس میں ایک بڑی الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس وقت کمرے میں کافی بھیڑ تھی۔ محلے کے بزرگ لوگ اور باچا خان کی تقریباً ساری اولاد جمع تھی۔ امام مسجد ایک اہم موضوع پر بات کر رہے تھے...... صنم تراشی پر اور صنم تراش پر...... یعنی زرک خان......

رات کو حبیب الرحمن کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ ایک طرف کونے میں دوپٹے کا کونا مروڑ کر کھڑی نغمہ اور سر پکڑے شاہ گل بیٹھی تھیں اور دوسری طرف نیک احمد...... جس کی آنکھوں میں کرختگی تھی۔

"ہم اب اس صنم تراش کو اپنی نیک بہن کا ہاتھ دیں گے؟" اس کا لہجہ اکساتا ہوا تھا۔

حبیب الرحمن نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کھڑکی کے پٹوں سے ہوائیں ٹکرا رہی تھیں۔ نغمہ کے چہرے پر سے پلو گرا اور آنکھوں میں وحشت اتری۔ اس کی آنکھوں میں اس کے بت توڑنے کے ارادے آگ پکڑ رہے تھے......

سہ پہر کے بعد رستم خان کے صحن میں چارپائیاں ہنوز اپنی جگہ پر تھیں۔ پھر سے صحن دونوں گھرانوں کے تمام افراد سے بھرا ہوا تھا۔ غصے سے پاگل ہوتے رستم خان، وحشت زدہ مور جانہ، نفرت آنکھوں میں سموئے نیک احمد اور چپ سی نغمہ ...... بس اس انسان کی کمی تھی، جو ابھی دروازہ کھول کر مسکراتا آ رہا تھا، معاً اس کی مسکراہٹ تھمی......

☆☆☆

لاہور سے آتے ہوئے زرک کے چہرے پر ایک مستقل مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں نغمہ کا سراپا تھا۔ سرخ گوٹا کناری لگے دوپٹے میں مڑ کر دیکھتی نغمہ جس کے چہرے پر ایک لٹ گر آئی ہے...... اور وہ فوراً اس کو کانوں کے پیچھے اڑس دیتی ہے۔

جب وہ گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ صحن میں سب موجود تھے۔ ان کے چہرے پر سے مسکراہٹ تھمی اور آگے بڑھ کر اس نے سلام کرنا چاہا...... لیکن کسی نے بھی اس کے سلام کا جواب نہیں دیا...... زرک نے جواب چاہتی نظروں سے مور جانہ کو دیکھا اور ان کا زرد چہرہ مزید زرد پڑ رہا تھا۔ سفید لیس والے دوپٹے کا پلو مروڑ کر منہ پر رکھے وہ اپنی سسکیاں دبا رہی تھیں۔ پھر زرک کی نظریں نغمہ پر پڑیں...... اس نے فوراً نظریں چرائی تھیں۔ معاً دادا جی آگے بڑھے......

آنکھوں میں انگارے تھے اور الفاظ انہی انگاروں میں دہکتے ہوئے......

"تم لاہور میں کیا کرتے تھے؟"

اس نے جواب دینے سے پہلے مڑ کر نیک احمد کو دیکھا، جو اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتا اس کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کو نیک احمد اور اپنی ملاقات یاد آئی اور وہ بھول گیا تھا کہ پچھلی بار بھی اس کی اسکیچنگ کو سب کے سامنے لانے والا وہی تو تھا...... تو وہ یقیناً بتا چکا تھا سب کو۔

"میں وہاں مصوری سیکھنے گیا تھا۔" اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

"مصوری؟" اس کے جواب پر نیک احمد نے طنزیہ ہنسی ہنس کر پوچھا تھا۔ "مصوری...... یا صنم تر

اٹھی؟"

"ہاں...... مصوری...... اور مجسمہ سازی سیکھنے......" اس نیک احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اسی وقت ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا اور اس تھپڑ کی تقلید میں دو اور تھپڑ بھی پڑے۔ مور جانہ، عباس لالہ اور برکت ماما فوراً ایک ساتھ اٹھے۔ برکت ماما باپ بیٹے کے درمیان کھڑے ہوئے۔

"واسے کوے رستمہ (یہ کیا کر رہے ہو رستم)...... جوان جہاں بیٹے پر ہاتھ اٹھا رہے ہو۔"

"ہاں...... اٹھا رہا ہوں۔ کیسے ڈھیٹ پن سے یہ کہہ رہا ہے کہ یہ بت تراشتا تھا اب تک...... تین سال...... تین سال اس نے کتنے بت تراشے ہوں گے؟ پوچھو اس سے۔ اس ملعون کی وجہ سے اس گھر پر عذاب اترا ہے۔ پہلے سلطانہ آدے مریں، پھر اس کی ماں بیمار ہو بیٹھی، طلعت کا بیٹا مرا، پورا ایک کھیت جل گیا...... ہر طرف سے عذاب نازل ہو رہے ہیں...... لوگ کہتے تھے کہ یہ کسی نے جادو کیا ہے لیکن انہیں یہ نہیں پتا تھا...... ہمیں یہ نہیں پتا تھا کہ یہ ہمارے صنم تراش بیٹے کے گناہوں کی سزا ہے۔"

رستم خان اتنی تیز آواز میں بول رہے تھے کہ ان کے گلے کی رگیں نیلی پڑتے ہوئے ابھری ہوئی تھیں...... ان کی آواز آخر میں پھٹ سی گئی...... ان کی چنگھاڑتی آواز پر دیوار پر سے پڑوسی بھی جھانکنے لگے۔

"خدا میرے گناہوں کی سزا کسی بے گناہ کو کیوں دیں گے؟" زرک کا دائیں گال سرخ اور جل رہا تھا۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں اہانت کی کرچیاں تھیں اور غصہ کی لے میں بجتی آواز میں اپنے لیے احتجاج سنا تھا۔

"کیوں نہیں دیں گے۔ ہر قوم پر سزا اس قوم کے گناہوں......"

اس نے غصے سے اپنے باپ کی بات کاٹی تھی۔ "وہ اجتماعی گناہ ہوتے تھے...... اور میں نے کیا برا کیا ہے؟ یہ نئے زمانے کے فن ہیں۔ آرٹ کہتے ہیں اس کو۔ زمانہ قدیم سے چلے آ رہے ہیں۔ میں مجسمہ بناتا ہوں...... اس کو پوجتا نہیں ہوں......"

"پوجتے بھی ہو گے...... یہ خدائی وصف ہے۔ اسلام میں اس کی سخت ممانعت ہے۔ تم اب اسلامی تعلیمات کے خلاف کھڑے ہو گے؟" نیک احمد بھی تیزی سے اٹھا اور اونچی آواز میں غصے سے بولا۔

"نہیں...... میں پوجتا نہیں...... میں اس کو فن کے طور پر بناتا ہوں۔ میوزیمز میں رکھے جاتے ہیں، چوکوں پر...... یہ زمانے گزر جانے کے بعد تاریخی بن جایا کرتے ہیں......" اس نے دلیل دینی چاہی، لیکن فوراً اس کو اندازہ ہوا کہ اس کی دلیل نہ تو ٹھوس تھی اور نہ ہی وہ قائل ہوئے تھے۔

"تم اس کو چھوڑ دو...... بس! اللہ سے رجوع کرو...... اپنی معافی کے لیے...... اپنے گناہوں کے لیے......" رستم خان نے ایسے انداز میں کہا کہ جیسے وہ مزید اس کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش رہا، جب بولا تو اس کی آواز میں قطعیت تھی۔

"میں یہ نہیں چھوڑ سکتا۔"

اس کی بات پر رستم خان مڑے۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آج کے بعد نہ میرا تم سے کوئی تعلق ہے اور...... میرے خاندان میں سے کسی کا...... اگر کسی نے تم سے رابطہ کیا یا بات کی تو اس سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں......" پھر وہ مور جانہ کی طرف مڑے جو تڑپنے لگی تھیں۔ "تم بھی...... تم بھی اگر اس سے تعلق رکھو گی تو اسی وقت میں تمہیں طلاق دے دوں گا...... پھر اس سفید سر کے ساتھ طلاق یافتہ کا اعزاز سینے سے لگائے پھرنا...... اپنے اس بت تراش ملعون بیٹے کے ساتھ......"

مور جانہ رونے لگیں۔ وہ مڑیں اور زرک خان کے پاس جانے لگی۔

"چھوڑ دو زرک جانہ! خیر دے زما دہ پارہ (خیر ہے میرے لیے)"

"کیوں چھوڑوں میں؟ یہ میرا جنون ہے...... شوق ہے...... میں اس کے آگے مجبور ہوں...... لوگ گانے گاتے ہیں‘ سنتے ہیں۔ اس کو آرٹ کہتا ہے آج کا زمانہ......" وہ روہانسا ہوا تھا۔ اپنے باپ کے سامنے اس کا غصہ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ ساری عمر ان کی محبت بھری ایک پکار کے لیے وہ ترستا رہا اور اب وہ کتنی آسانی سے اس سے لاتعلقی کا اعلان کر چکے تھے...... "میں یہ نہیں چھوڑ سکتا‘ خیر وہ والجی...... آپ ایسے میرے ساتھ تعلق ختم نہیں کر سکتے......"

"میں کر چکا ہوں......" لاتعلقی کی پہلی سرد مہری ان کی آواز میں در آئی۔ "میں اس گھر میں بت تراش نہیں رہنے دوں گا۔ تمہارے اس میلے میں جا کر میں ابراہیم علیہ اسلام کی طرح سارے بت توڑ نہیں سکتا...... لیکن یہ لاتعلقی کر سکتا ہوں...... دل تو چاہتا ہے‘ کہ بڑے قبرستان میں گڑھا کھود کر تمہیں سنگسار کر کے مار دوں...... لیکن......"

"جب آپ کر چکے ہیں لاتعلقی کا اظہار تو ہم بھی اس ملعون کے ساتھ اپنی بہن کا رشتہ نہیں رکھنا چاہتے......" نیک احمد کی آواز میں نفرت بھی تھی اور حقارت بھی......

وہ کرنٹ کھا کر فوراً مڑا‘ اس نے نغمہ کو دیکھا اور اگلے ہی پل وہ اس کی جانب بڑھا تھا۔

"نغمہ مجھے نہیں چھوڑ سکتی...... میں نغمہ کو نہیں چھوڑنے والا......" اس کی آواز میں قطعیت تھی۔ نغمہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے......

"یہ تم سے کوئی تعلق نہیں رکھے گی۔" نیک احمد کا انداز حتمی تھا۔ سب یک ٹک زرک اور نغمہ کو دیکھ رہے تھے۔

نغمہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔

اس نے ملتجیانہ نگاہوں سے زرک کو دیکھ کر منت کرتے لہجے میں کہا تھا۔

"چھوڑ دو زرک...... سب کہہ رہے ہیں......"

"نہیں چھوڑ سکتا...... تم میرے ساتھ چلو......"

"زرک دیکھو...... ایسا مت کرو......"

"یہ سب نیک احمد اپنے بدلے......" اس نے کہنا چاہا لیکن نغمہ کی کاٹ دار آواز نے اس کا جملہ وہیں روکا تھا۔

"ہاں...... نیک احمد بدلے میں کر رہا ہے۔ مان لیا میں نے؟ لیکن کیا وہ جس بات پر بدلہ لے رہا ہے؟ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو؟ بولو تم کہہ دو کہ ہاں میں نہیں تراشتا بت...... ہر بار تم ٹھیک نہیں ہوتے زرک‘ اس بھرم سے نکل آؤ......" نغمہ نے پھر زرک کرب کو دیکھا...... اپنے بھائیوں کو‘ اپنے باپ کو...... اور فیصلہ اس کے سامنے تھا۔ صاف اور اٹل۔ "تم اس کو نہیں چھوڑ سکتے...... تو مجھے چھوڑ دو...... میں تمہیں چھوڑ رہی ہوں...... میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔"

"نہیں‘ تم ایسا نہیں کر سکتیں‘ نغمہ تم تو مجھ سے محبت کرتی ہوں ناں؟" وہ پاگل سا ہونے لگا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں نغمہ!" وہ رونے لگا تھا۔ پھر مڑا۔ "والجی...... آپ......"

اسی وقت نیک احمد نے اس کو بازو سے پکڑ کر دھکیلا۔ وہ لڑکھڑایا تھا۔ برکت ماماجی فوراً آگے بڑھے۔ "حد میں رہو نیک احمد!" پھر زرک سے مخاطب ہوئے، "اٹھو میرے ساتھ چلو......"

"اس کو لے جا رہے ہو‘ پھر کبھی لوٹ کر مت آنا برکت!" رستم خان کی خبردار کرتی آواز......

"مجھ سے کوئی تعلق مت رکھو تم...... کوئی شوق نہیں مجھے بھی تم سے تعلق رکھنے میں...... تم نے اس کو بیٹا ماننے سے انکار کر دیا ہے‘ آج سے یہ میرا بیٹا ہے۔" برکت ماما کی آواز میں ان کے لیے نفرت تھی۔

☆☆☆

بیہ کڈے بار گی
(پھر ہجرت کا ساماں باندھا جا رہا ہے)
پاڑی وا چول او خانوں کی
(اونٹوں میں رسیاں ڈال دیے ہیں)
سہ او کمہ خدایا
(کیا کروں خدایا)
زڑہ میں بندوی پہ کوچیانوں کی......

(دل بند ہے کوچیان میں)

صحن خالی ہو چکا تھا اور برآمدے میں برکت ماما اس کا اور اپنا سامان باندھ رہے تھے۔

بیہ کڈے تاڑلے شی

(پھر ہجرت کا سامان باندھا جا رہا)

راتہ خکاری چہ بلسند تہ زی۔۔۔۔

(ایسا لگ رہا ہے کہ بلسند جا رہے ہیں)

نیک احمد، داجی، شاہ گل اور باقی سب برآمدے کی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ سب کے چہرے سپاٹ تھے۔ صحن میں نغمہ کے قدم تھمے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں بہہ رہے تھے۔

اس کی نظروں میں ایک منظر تھا۔ کسی کی شادی کا۔ اس کی پڑوسن نیک احمد کے چرس والے واقعے پر اپنی سہیلی کے کان میں کسی نیک احمد کے بارے میں پوچھ رہی۔

"نیک احمد کیا چرسی ہے؟"

وہ مڑی اور اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔ "اور اپنے چرسی باپ کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ جو عنقریب تمہیں صنم خان کو بیچنے والا ہے؟"

"ہیں؟ دماغ خراب ہو چکا ہے کیا نغمے تمہارا؟" لڑکی غصہ ہوئی۔

"ہاں ہوا ہے میرا دماغ خراب۔۔۔۔ اور جب میرا دماغ خراب ہوتا ہے میں لوگوں کے چہرے خراب کر دیتی ہوں۔ اگلی دفعہ میری بھائیوں کے بارے میں ایسی ویسی باتیں کیں تو میں بھی نادان بابا (نہر کا نام) کے پل کے نیچے تمہاری اور گلزار کی "ملاقاتوں کے قصے" مشہور کر دوں گی۔۔۔۔" یہ کہہ کر وہ تن فن کرکے جانے لگی۔ اس لڑکی کی سہیلی اس کو سمجھا رہی تھی۔

"نغمہ بھائیوں کے خلاف باتیں برداشت نہیں کرتی۔"

خوگ آشنا دے بل وطن تہ زی

(پیارا جانان دوسرے وطن جا رہا ہے)

زہ ئی پریخودم دلتہ

(مجھے چھوڑ دیا یہاں)

زرہ ئی اوڑو پہ چشمانوں کی

(دل لے گیا اپنی آنکھوں میں)

بیہ کڈے بار یگی

برآمدے میں مور جانے کی رونے کی آواز میں تیزی در آئی جب زرک نے دہلیز پار کی۔ سامنے گاڑی کھڑی تھی اور دور بجلی کے تاروں میں پھنسے اس گلی کے اکلوتی لائٹ کی زرد روشنیوں کے سامنے کئی پتنگے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی روانہ ہوئی۔

اس نے گاڑی کے شیشے سے سر ٹکایا۔ اس کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں اور آنسو سوکھ چکے تھے۔۔۔۔ وہ مجنونیت کے پہلی سیڑھی پر قدم دھر چکا تھا۔

بس کہ ستم گرے

(بس کرو ستم گر)

دا سی مہ کوہ آشنا نہ سرہ

(ایسا مت کرو اپنے جانان کے ساتھ)

سور رومال می ستہ دے

(سرخ رومال تمہارا ہے)

دغہ جبہ می دہ تہ سرہ

(یہی زبان دی ہے تمہیں)

سر کا می خو کیگی۔۔۔۔

(اگر سر بھی زخمی ہو)

"نغمے! اوپر آؤ۔۔۔۔" شاہ گل نے اس کو پکارا لیکن نغمہ کے کانوں میں کئی آوازیں تھیں۔

"نغمہ! تم بہت جلد پچھتاؤ گی۔" زرک کی آواز کسی ضرب کی طرح پڑ رہی تھی اور معاً اس کے دل میں ٹیس اٹھی۔ وہ مڑی۔ نیک احمد اس کی اور بھاگا اور اس کو بازو سے پکڑا۔

"وہ جا رہا ہے۔۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔۔" اس کی آواز میں التجا بھی تھی اور چیخ بھی۔۔۔۔

"جانے دو۔"

"وہ میرے بغیر مر جائے گا۔۔۔۔" اس بار بار تیز آواز میں رونے لگی۔

"مرنے دو۔"

digest Novels Lovers group
UrduNovels.com

"میں اس کے بغیر مر جاؤں گی......" اب کی بار وہ نہیں روئی تھی...... یوں جیسے اس نے موت دیکھ لی اور مر گئی...... ایک تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا۔

"بے حیا! اس دہلیز سے تم صرف میت کی صورت ہی نکل سکتی ہو۔"

نیک احمد نے اس کو بازو سے پکڑ کر کھینچا تھا۔ اس نے زور سے اس سے بازو چھڑوایا اور اوپر کی جانب بھاگی...... سب اس کے پیچھے بھاگے...... جب وہ پہنچے تو نغمہ چار دیواری سے جھانک رہی تھی۔ یوں جیسے کوئی اس کی روح ضبط کر چکا تھا' اس کی آنکھیں ایسی پھیلی تھیں۔...... دور گلی کے نکڑ میں گاڑی نے چکر کاٹا تھا۔

زہ بہ تہ شم وہ بل چہ سرہ
(میں کسی اور کا نہیں ہو جاؤں گا)
ستہ بہ تہ سترگے غاڑوے پہ آشنایانوں کی
(تم کیسے کھولو گے اپنی آنکھیں نئے آشناؤں میں)
بیہ کڈے یار گی......

☆☆☆

اس کی حالت بہت خراب تھی۔ جب سے وہ چارسدہ آیا تھا اس کو تیز بخار تھا۔ ساری رات وہ بخار میں تپتا رہا۔ برکت ماما ساری رات جاگتے رہے۔ ان کا دل اس کے لیے دکھ سے بھر چکا تھا۔ ان کی اپنی اولاد نہ تھی' لیکن وہ اپنی بہن کا درد اس سے سمجھ رہے تھے۔

بچوں کو سمجھانے کی کئی زبانیں ہوتی ہیں...... لیکن یہاں 'مار' کی زبان بہت کارگر سمجھی جاتی ہے۔ اس سے بچے یا تو خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں یا پھر باغی ہو کر مزید اس آگ میں کود جاتے ہیں۔

صبح کی روشنی جب اس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر دستک دینے لگی تو وہ تڑپ رہا تھا۔ یوں جیسے کسی نے اس کے وجود کو شکنجے میں جکڑ رکھا ہو...... سختی سے کس کر...... وہ ہل نہیں پا رہا تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے وہ بس دو جملے دہرا رہا تھا۔

"تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو' ناں؟"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں' نغمہ!"

معاً وہ تڑپ کر اٹھا تو اس کے سامنے ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔ اس کے ہم عمر لڑکے کا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا لیکن وہ سن نہیں پا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں وہی دو جملے تھے جو بار بار گونج رہے تھے اور اس پر غالب ہوتی رستم خان کی چنگھاڑتی آواز...... "میرا اس سے کوئی تعلق نہیں......"۔

"زرک بچے! یہ دوائی کھا لو۔" برکت ماما اس کو بازو سے ہلا کر اس کو دوائی کے ساتھ پانی دے رہے تھے۔ یہ پہلا جملہ تھا جو اس نے ان دو دنوں میں سنا تھا۔ برکت ماما زبردستی اس کو دوائی پلا کر چلے گئے۔

قاسم دیر تک اس کے ساتھ بیٹھا رہا۔ اس کو ماما نے بھیجا تھا کہ اس کے ساتھ باتیں کرے۔ تاکہ اس کا دماغ انہی سوچوں کے گرد نہ گھومے لیکن ان کو نہیں پتا تھا وہ اس میں کامیاب نہیں ہونے والے تھے کیونکہ باتوں باتوں میں قاسم کے منہ سے نکلا تھا اور فوراً اس کو اپنی سنگین غلطی کا احساس ہوا تھا۔

"صاحبزادہ خان کے بیٹے سے نغمہ کی شادی ہو گئی......"

☆☆☆

"ادھر آؤ...... ان کیسٹس میں سردار علی ٹکر کے سارے کیسٹس علیحدہ کر کے ایک طرف رکھ دو۔" وہ کھڑکی میں بیٹھا' آسمان کو تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے حلقے اتنے گہرے ہو چکے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ کسی نے سیاہی مل دی ہو۔ وہ چپ چاپ اٹھا اور ٹیپ ریکارڈ میں ایک ایک کیسٹ لگا کر تھوڑی دیر سنتا اور پھر ایک طرف کر دیتا...... اس کام میں اس نے کئی گھنٹے صرف کیے......

برکت ماما اس کے دھیان بٹانے کے لیے ایسا کرتے تھے کہ اس کو کسی کام میں لگا دیتے اور وہ اسی میں مصروف رہتا۔ کبھی اپنے ساتھ کیاریوں میں لگا دیتے...... سارا دن وہ دونوں ٹماٹر کی کیاریوں میں لگے رہتے...... کبھی وہ باورچی خانے اپنے ساتھ کھڑا

کرتے اور اس کو کھانا پکانا سکھاتے رہتے......

"ہم مشرقی مرد کھانے کے لیے بہت عورتوں پر منحصر ہوتے ہیں...... حالانکہ یہ بہت آسان لیکن دل سے کرنے والا کام ہے......بس دیکھو مجھے...... پیاز کاٹو ٹماٹر کاٹو......اور......" برکت ماما جی ایک ایک چیزیں کاٹتے اور پکانے کے ہر مرحلے کے بارے میں تفصیل سے بتاتے جارہے تھے۔

"کھانا پکانے سے مرد عورت نہیں بن جاتے ......اگر ایک دن تمہاری بیوی بیمار پڑ جائے تو تم بنالینا اس کی جگہ......" برکت ماما جی اپنے ہی دھن میں کہہ رہے تھے کہ ایسے میں وہ رکے...... انہیں اندازہ بھی نہیں ہوا کہ بولتے بولتے وہ زرک کی دکھتی رگ چھیڑ چکے تھے۔

وہ فوراً باہر نکلا اور برکت ماما جی نے تاسف سے اس کو دیکھا۔

اس کے بعد برکت ماما کافی احتیاط برتنے لگے تھے۔ وہ اس کی صحت کا خیال رکھتے' لیکن اس دوران وہ اپنی صحت بھول سے چکے تھے۔ بہار کے اوائل کے دنوں میں ان کی زندگی پر خزاں کا موسم مسلط ہو گیا۔ ایک دن ان کو ہارٹ اٹیک آیا۔ ڈاکٹرز نے آپریشن کرنے کا کہا اور برکت ماما نے منع کر دیا......

"ویسے بھی اتنا کم وقت بچا ہے...... میں اپنے جسم کو تار تار نہیں کرنا چاہتا......" ان کے انداز میں دکھ نہیں تھا' ایک عجیب قسم کا سپاٹ پن تھا۔ اس نے خوب منایا لیکن وہ اپنی ضد پر ڈٹے رہے۔

ان دنوں ان کے گھر ایک وکیل کافی آتا جاتا رہتا۔ انہوں نے اتمان زئی بازار میں چار دکانیں' اپنا گھر اور اپنے حصے کے کھیت سب اس کے نام کر دیے تھے۔

"اللہ سے شکوہ تھا کہ ایک تو بے اولاد بنایا مجھے' پھر محبوبہ جیسی بیوی بھی چھین لی...... لیکن اب دونوں شکوے نہیں رہے۔ تمہاری صورت اولاد بھی مل گئی' اور محبوبہ جیسی بیوی سے ملنے بھی جارہا ہوں......" آخری بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسے لیکن وہ ہنسا نہیں۔

......دکھ بھری نظروں سے ان کو دیکھتا رہا......

اس کی زندگی میں اس سے پیار کرنے والے ایک ایک کر کے سب فوراً جارہے تھے۔ وہ اکیلا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

برکت ماما کے جنازے پر صرف عباس لالہ اور مور جانہ آئی تھیں۔ تین دن ٹھہر کر جب وہ جانے لگیں تو اس سے مل کر رو پڑیں...... اس کے گال چومتے ہوئے مور جانہ روتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"بس کر دو......آجاؤ! خدمت کرو......"

وہ سر نفی میں ہلاتا رہا...... آنسو کی ایک لکیر اس کے چہرے پر بہہ رہی تھی۔ آج مور جانہ اس کو یہ بھی نہیں کہہ رہی تھیں جب وہ بچپن میں رویا کرتا تھا کہ بس کرو' مرد نہیں روتے......!

مور جانہ چلی گئیں اور وہ اکیلا رہ گیا۔ اس کی سوچیں اب مزید خطرناک ہونے لگی تھیں۔ اس نے گھر کے پچھواڑے میں بنے اس اسٹور کو خالی کیا۔ اور قاسم کے ساتھ اسکلپچر کا سارا سامان لا کر یہاں اسٹوڈیو بنایا۔ جس کے لیے وہ دھتکارا گیا تھا' وہ اب اس کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ بھی ہوتا لیکن جب وہ ہاتھ گارے سے گندے ہو جاتے تو وہ پھر رکتا نہیں...... گھنٹوں گھنٹوں لگا رہتا...... مجسمہ پر کام کرتا' اس کی کمر اکڑ جاتی لیکن وہ رکتا نہیں تھا......

اس سارے عمل کے دوران اس کی حالت مزید بگڑتی جارہی تھی۔ یادیں کسی سلو پوائزن کی طرح اس کی نس نس میں سرایت کر رہی تھیں۔ اس کے ذہن کی جڑیں بنجر ہو رہی تھیں اور دل پر بوجھ پہاڑ بنتا جارہا تھا۔

قاسم روز آتا۔ اس کے ساتھ چائے پیتا۔ اس کو زبردستی اپنے ساتھ والی بال میچ دیکھنے لے جاتا۔ پھر قاسم نے آنا بند کیا اور اس کی حالت ایک دفعہ پھر سے بگڑنے لگی......

وہ جس سرزمین پر قدم دھر چکا تھا' وہ قیس کی سرزمین تھی...... مجنونیت کی......

☆☆☆

"زرک......زرک......"

کوئی اس کو پکار رہا تھا۔ اس کے تھوڑی بڑھی داڑھی پر کسی کے نرم ہاتھ جمے ہوئے تھے۔ جو آہستہ آہستہ اس کے چہرے کو تھپتھپا رہے تھے لیکن اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے پار دھند لگے تھے۔

زرمینہ اس کے گالوں پر ہاتھ رکھے اس کو ہوش میں لانے کے لیے آوازیں دے رہی تھی۔ معاً اس کی سرگوشیاں تھم گئی تھیں اور زرمینہ کا ہاتھ بھی...... چہرے کا رنگ فوراً متغیر ہوا اور وہ باہر کی اور بھاگ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر کے صحن میں پکار رہی تھی...... "قاسمہ! قاسمہ!"

اس درد بھری پکار پر پہلے بھابھی نکلیں اور پھر قاسم......

"کیا ہوا ہے زرمینے؟ یہ رنگ کیوں سفید پڑ رہا ہے تمہارا؟" رخسانہ آگے بڑھیں اور بیٹی کی متوحش آنکھوں میں جواب ڈھونڈنے لگیں۔

"قاسم! جلدی سے گاڑی کا انتظام کرو...... کسی ڈاکٹر کو بلاؤ...... وہ...... زرک بے ہوش چکا ہے...... زرک......" اس کی آواز رونے کی وجہ سے لکنت کا شکار ہوگئی۔ قاسم، جس کے چہرے سے اب صحت یابی جھلکتی تھی، فوراً باہر بھاگا اور اس کے پیچھے وہ......

جب گھر پہنچی تو اسٹوڈیو میں وہ ویسے بے ہوش پڑا تھا۔ آنسو کی لکیر اس کے چہرے پر اب سوکھ چکی تھی۔ ایسے میں قاسم داخل ہوا اور اس کو اٹھا کر اس کے کمرے میں لے آیا۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر کے پیچھے گیا اور جب ڈاکٹر آیا تو انہوں نے بس یہی بتایا۔

"ان کی صحت کا خیال رکھیں، زیادہ سے زیادہ پانی پلائیں اور...... یہ کچھ دوائیاں ہیں، اگر نیند نہیں آتی ہو تو ان کو یہ نیند کی دوائیاں دیں۔" چٹ لکھ کر قاسم کو تھمائی۔ دوسرے کمرے کی کھڑکی میں پردہ کیے کھڑی زرمینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ ان چاہی بیوی سہی وہ تو من چاہا محبوب تھا۔

"اور سب سے اہم بات...... انہیں کسی اچھے نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھائیں۔" یہ کہہ ڈاکٹر چلا گیا اور اس کے پیچھے قاسم بھی۔

وہ زرک کے کمرے میں چلی آئی، اس نے دیکھا کہ اب ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ سکون کی نیند سو رہا ہے۔ زرد ماتھے پر اس کے بال بکھرے تھے۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اور اس کا ہاتھ تھاما۔ آنسو زار و قطار اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اس کو بس اتنا پتا تھا کہ تیک احمد نے اپنی بہن کا رشتہ توڑ دیا تھا اس سے...... اور پھر رستم خان نے اس سے لاتعلقی کا اعلان کیا اور اس کے پیچھے زرک کی 'مجسمہ سازی' تھی۔

وہ جانے کتنی دیر اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی رہی۔ اس کے انداز میں جھجک نہیں تھی اور نہ ہی اس کا خوف۔ نکاح صرف نام کا ہی سہی، وہ اس کا ہاتھ تھامنے کا حق رکھتی تھی۔ ساری رات وہ اس کے سرہانے کسی جوگن کی طرح بیٹھی رہی۔ طاق میں رکھی شمع جلتی رہی...... بالکل اس کے دل کی طرح...... موم ہوتی اور فنا ہوتی......!!

☆☆☆

اگلی صبح روشن تھی اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیتی مزید چمک رہی تھی۔ اس کی گردن میں ایک ٹیس اٹھی اور اس نے گردن پر ہاتھ رکھ کر سر اٹھایا تو وہ ہنوز سو رہا تھا۔ زرمینہ اس کی چارپائی کے ساتھ کرسی لگائے اسی پر سو گئی تھی۔ وہ فوراً باہر نکلی، اس سے پہلے کہ اس کی آنکھیں کھل جائیں۔

اس نے چائے کے لیے پانی چڑھایا اور دیسی گھی میں پراٹھے بنانے شروع کیے۔ جب وہ اس کے کمرے گئی تو وہ اٹھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی اداسی اور یاسیت تھی۔

"آپ کل کچھ زیادہ ہی سو گئے تھے۔" وہ چائے رکھتی اس کو مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ اب وہ اس کی نظر اندازی پر آنسو نہیں بہانے والی تھی۔

"میرا کام رہ......" وہ اٹھنے لگا تھا۔

زرمینہ فوراً اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ "پہلے چائے پئیں۔ آپ ویسے بھی کچھ زیادہ ہی کام کر چکے ہیں۔"

دونوں کی نظریں ملیں۔ زرک نے دیکھا کہ وہ

نیلی آنکھیں پہلی بار اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ وہ بے باک آنکھیں...... اس نے نظریں موڑیں اور سر جھٹکا تھا۔

"میں تم سے کہہ چکا ہوں۔ ہم ایک دوسرے پرائی رائے' اپنے فیصلے کچھ مسلط نہیں کریں گے۔"

"یہ نہ تو رائے ہے نہ کوئی فیصلہ...... بس ایک پیالی چائے ہے اور دو پراٹھے......" اس نے مسکرا کر دو بدو جواب دیا تھا۔

اس بار زرک کو چپ ہونا پڑا۔

"غسل خانے میں آپ کے کپڑے رکھ دیے ہیں۔ نہا لیجیے۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکلی۔ جیسے ہی باہر نکلی تو اس کا دل انتہائی دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور اپنی واری جاتی نظروں میں کوئی منافقت بھی شامل نہ کر پائی ......اس کی محبت بغاوت پر اتر چکی تھی۔

☆☆☆

اس کے بعد کچھ دن زرک اپنے اسٹوڈیو نہیں گیا اور زرمینہ نے یہ غنیمت جانا۔ وہ صبح اس کی آنکھیں کھلنے سے پہلے اس کے لیے نئے کپڑے نکال کر غسل خانے میں رکھتی۔ پھر چائے بنا کر اس کے ساتھ بیٹھ کر اس سے بے تکے سوالات پوچھتی ۔ وہ صرف 'ہاں' اور 'نہیں' میں جواب دیا کرتا لیکن وہ زرمینہ کی مستقل مزاجی سے زیادہ اس کا ڈھیٹ پن تھی۔

وہ چائے پی کر باہر نکلتا تو وہ اس کے پیچھے چلی آتی۔

"ان پودوں کو کتنا عرصہ ہوا کسی نے پانی نہیں دیا۔" وہ کیاری میں لگے پودوں کو یاسیت سے دیکھتی اور کہتی۔

زرک مڑ کر پہلے کیاریوں کو دیکھتا اور پھر مڑ زرمینہ کو...... زرمینہ ہنوز کیاریوں پر نظریں ٹکائے ہوتی۔ پھر کہہ کر وہ وہاں سے چلی جاتی اور پھر کچھ دیر بعد وہ دیکھتی کہ زرک کیاریوں میں لگا ہوتا۔ خود رو پودوں کو نکال کر اور اس کی مٹی میں کھرپی چلاتا...... اس کو یہ کام کرتے کچھ دیر ہی گزری ہوتی کہ ایسے میں زرمینہ اس کے ساتھ پودوں میں لگ جاتی ...... اور وہ پانی لا کر نیچے جھک کر اس کو پانی پیش کرتی ...... زرک کی خاموش نظریں اٹھتیں لیکن زرمینہ ویسے ہی پانی کا لوٹا لیے کھڑی ہوتی...... زرک اپنے کیچڑ لگے ہاتھ آگے کرتا اور وہ نیچے اس کے ہاتھوں پر پانی گرانے لگتی۔ جب وہ ہاتھ دھو کر جانے لگتا تو وہ چھوٹا تولیہ اس کو پکڑاتی۔ زرک سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھتا۔

"اب بچوں کے طرح دامن سے ہاتھ پونچھیں گے؟"

زرک اس کے مسکراہٹ دبائے چہرے کو دیکھ کر رہ جاتا۔ تولیہ پکڑ کر وہ ہاتھ پونچھتا اور اس کو پکڑا دیتا۔

جب سہ پہر کی دھوپ سمٹ کر منڈیروں پر ستانے لگتی۔ تو وہ اس سے آ کر پوچھتی۔

"کھانے میں کیا بناؤں؟"

"جو تمہاری مرضی......"

"نہیں' آپ بتائیں......" ضدی لہجہ۔

"کچھ بھی بنا لو۔"

وہ ہنوز کھڑی رہتی' تو اس بتانا پڑتا۔ جب دوپہر کا کھانا وہ بنا چکی ہوتی تو ہال میں دسترخوان سجا کر اس کو بلانے آتی۔

"کھانا تیار ہے۔"

وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھا کہتا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے تو ہے۔"

"تو جا کر کھاؤ۔"

"آپ بھی آئیں۔" وہی ضدی لہجہ۔

آج اس نے زرمینہ کو دیکھا تھا اس کی ناک پر غصہ دھرا تھا۔ معاً وہ اٹھا' زرمینہ اس کو دیکھتی رہی۔ زرمینہ کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوئیں۔ دو قدم...... تین قدم...... چار قدم...... اور وہ اس کے عین سامنے۔

زرک کا چہرہ اب زرد نہیں تھا۔ اس کا چہرہ اب چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں غصے سے بھری تھیں اور اس کی پرحدت سانسیں زرمینہ کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ زرمینہ جو سانسیں روکے کھڑی تھی۔ اس کو

یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ وہ ساکت اس لیے تھی کیونکہ زرک نے اس کو دونوں بازو سے پکڑا ہوا تھا۔

"کیوں کر رہی ہو تم یہ سب...... جان بوجھ کسی جن کی طرح میری حواسوں پر سوار ہو رہی ہو؟ مجھے کیا پہننا چاہیے' میں کیا کھانا کھانا چاہتا ہوں۔ مجھے کون سے پھول اگانے چاہئیں؟ تم یہ سب کس لیے کر رہی ہو؟"

اس کی آنکھیں بھرنے لگی تھیں۔ ان آنسوؤں میں زرک کا غصیلا چہرہ ٹھہر گیا۔

"اپنے لیے!" وہ بولی تو ایک آنسو ٹپکا تھا۔ آواز میں یک طرفہ محبت کی کرچیاں تھیں۔

"اپنے لیے؟" وہ استہزائیہ ہنسا تھا۔

"آپ مجسمے کیوں بناتے ہیں نغمے کے؟ کیوں......؟ اس لیے ناں کہ آپ کو معلوم ہے یہ بات کہ اس کی محبت آپ کو پاگل کر رہی ہے۔ ہر وقت اس کے مجسمے بناتے ہو کہ مجنونیت میں بس آپ کو ایک چہرہ یاد رہتا ہے...... اس کا...... نغمہ کا......" وہ بول رہی تھی اور آنسو بہتے جا رہے تھے۔ زرک کی گرفت اس کے بازوؤں پر ڈھیلی ہو گئی۔ "میں بھی کر رہی ہوں اپنے لیے...... آپ کی قربت پانے کے لیے......"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں' کہ ہمارا رشتہ محض نکاح کے دو بول تک محدود ہے۔"

"ہاں...... بتا چکے ہو...... جیسے وہ آپ کو بتا چکی تھی...... کہ اس کا آپ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ لیکن پھر بھی آپ اس سے اتنی محبت کرتے ہو...... آپ کو اختیار ہے اس پر؟"

"میں...... اس کو...... اس......" زرک کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ "میں اس کو بھولنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کا چہرہ میری یادداشت سے جاتا نہیں......" وہ پلٹا اور کرسی پر بیٹھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ "میں اس کی محبت میں بہت آگے نکل آیا ہوں۔" وہ اب زرینہ کو دیکھ رہا تھا...... یاسیت اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

اسی وقت زرینہ کا دل ڈوبا یوں جیسے کسی سمندر میں غرقاب ہوا ہو۔

"مجھے لگا تھا وہ میرے لیے کھڑی ہو گی۔ وہ سب کے سامنے کہے گی کہ میں زرک کو اس کی ہر کمی' اس کے ہر گناہ کے ساتھ قبول کرتی ہوں...... میں...... مجھے لگا تھا وہ سب کے سامنے میرا ہاتھ تھامے گی......" وہ کہہ رہا تھا اور یک ٹک زرینہ کو دیکھ رہا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے' جیسے پلکیں جھپکیں تو منظر تحلیل ہو جائے گا۔

"میں ساری عمر اپنے باپ کی محبت کے لیے ترستا رہا۔ وہ باقی بیٹوں کو چاہتے تھے لیکن ان کی زبان پر کبھی میرا نام نہیں آیا...... کبھی انہوں نے پیار سے مجھے بیٹا نہیں کہا...... پھر ان کو اپنے باپ ہونے کا حق یاد آیا' جب میرے گناہ انہیں دکھے...... تب ہی کیوں؟ اور اتنی آسانی سے کہہ دیا چھوڑ دو...... یا ہم لاتعلقی اختیار کر لیں گے......" زرک کے دل کے قبرستان میں دفن ہر خواہش اپنے قبروں سے نکل رہی تھی۔ "میں چھوڑ دینا چاہتا ہوں یہ۔ لیکن اب میں اتنا دور نکل آیا ہوں زرینہ کہ ہر سو اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں میں اکیلا ہوں...... اور یہ اندھیرا مجھے نگل رہا ہے...... میرا اب کسی چیز پر بھی یقین نہیں رہا۔ نہ محبت پر نہ رشتوں پر نہ...... اور...... نہ ہی خدا پر......" اب کی بار اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے تھے۔

زرینہ آگے بڑھی اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"پلٹ آؤ۔ چھوڑ دو مجسمہ سازی۔ معافی مانگ لو خدا سے...... وہ معاف کر دینے والا ہے...... پلٹ آؤ......" اس نے زرک کا ہاتھ تھاما تھا اور زرک نے اس بار اس کا ہاتھ جھٹکا نہیں تھا۔ "میرا ہاتھ تھامو میں تمہیں اندھیرے میں بھٹکنے نہیں دوں گی۔"

"تم مجھے کہہ رہی ہو' مجسمہ سازی چھوڑو؟ اور تم نے جو وہ بدعت کی تھی...... وہ گناہ نہیں سمجھو گی؟"

"میں تب بھی اس کو بدعت اور گناہ سمجھتی رہی لیکن پتا ہے' جب بات کسی پیارے کی زندگی کی ہو تو انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ میں بھی ہو گئی تھی۔ مجھے لگا کہ

اگر اس سے ٹھیک ہو سکتا ہے' تو مجھے کوئی پروا نہیں اپنی زندگی کی...... میں بھری ہوئی تھی جو اپنے من کی بات نہیں سن رہی تھی کہ اللہ پر یقین کرنا چاہیے تھا مجھے۔ اسی کے تو قبضے میں ہیں سب کی زندگیاں...... پھر ہوش آنے پر میرا ضمیر مجھے پچھتاوے کی دلدل میں دھکیلنے لگا......"

"اور تم نے کیا کیا؟" وہ اب اس کو دیکھ رہا تھا۔

"میں نے اس سے معافی مانگی...... جس کے صفات میں ایک معاف کر دینے کی صفت بھی ہے۔"

"اور پھر......؟"

"اور اس کے بعد میرا دل ہلکا ہو گیا کسی مخمل سے بے پر کی طرح......!!!"

وہ بول رہی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

ان دو گھروں میں ایک دیوار کھڑی کی جا چکی تھی۔

نیک احمد کی بھی شادی ہو گئی اور لیاس اور علی خان کی بھی...... نغمہ شادی کے بعد بہت کم آئی تھی۔ اس کا شوہر انتہائی شریف انسان تھا۔ قریبی گاؤں کے امیر خاندانوں میں سے ایک۔ وہ وہاں راج کر رہی تھی۔ یہ ان کا ماننا تھا لیکن درحقیقت اس کی زندگی ایک جہنم تھی۔ آج وہ اپنی بیٹی کی پیدائش کے بعد چالیسویں سے نہائی تو اپنے گھر آئی تھی۔ وہ بھی شاہ گل کے بار بار بلانے پر۔

نغمہ، نغمہ نہیں رہی تھی۔ وہ ایک مرجھایا ہوا پھول تھی' جس کے حسن کو اسد اللہ نے گہنا دیا تھا۔

"وہ خاوند ہے تمہارا' اگر دو تھپڑ مار بھی دے تو برداشت کر لیا کرو۔ دیکھا نہیں ہے تم نے کیسے میری ساری بہوئیں اپنے شوہروں کو مٹھی میں کر چکی ہے۔ ابھی تو میں زندہ ہوں' تمہارا دادا جی زندہ ہے۔ اس کے بعد تو یہ تینوں تمہیں......" شاہ گل اس کو سمجھا رہی تھیں لیکن وہ کچھ سن نہیں پا رہی تھی۔ وہ یک ٹک اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ جو بالکل اس کی طرح تھی۔ خوب صورت اور معصوم۔

"میں چلتی ہوں بس!" وہ اٹھنے لگی۔

"ارے ابھی تو آئی ہو تم۔ اتنی جلدی میں......" شاہ گل نے اس کو روکا تھا۔ لیکن اس نے اپنی بیٹی کا بیگ اٹھایا اور پھر برقع۔ باہر نکلی تو برآمدے میں سفید نماز کی ٹوپی سر پر' سیاہ واسکٹ اور اس پر پلو......نیک احمد اس کو دیکھ کر رکا اور وہ اس کو بنا دیکھے نظر انداز کرتی جانے لگی۔ ایسے میں اس کے پیچھے' اس کو پکارتی شاہ گل نکلیں۔

"نغ...... نغمے!"

نغمہ کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن وہ رک نہیں رہی تھی۔ جیسے ہی وہ دروازے تک گئی' اسی وقت دروازہ کھلا اور اس نے جو دیکھا۔ اس کی سانسیں تھمیں اور قدم بھی......!

دروازہ کھول کر آتی اس نے لڑکی نے اپنا سفید برقع اتارا تو اس نے دیکھا...... سلک کی سیاہ شلوار قمیص پہنے لڑکی' اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے سرخ بنارسی دوپٹا اوڑھ رکھا تھا' جس کے چاروں طرف سنہرا بنارسی بارڈر تھا اور بیچ میں تین پتوں والی سنہری بوٹی...... اس لباس میں لڑکی کا دودھیا چہرہ مزید اجلا اجلا لگ رہا تھا اور سرخ لپ اسٹک لگائے اور چہرہ گلابی...... کاجل لگی نیلی آنکھیں...... ایک لڑکی اتنی حسین کیسے دکھ سکتی تھی......اس لڑکی کا حسن نہیں تھا' جس سے اس کے قدم تھمے تھے۔ بلکہ اس لڑکی کی اوٹ سے نکلا وہ......

سفید اجلے کاٹن کے شلوار قمیص پر سیاہ نیا نکور واسکٹ پہنے وہ شخص...... جس کی تباہی میں کچھ حصہ وہ بھی رکھتی تھی۔ اس کے سیاہ ریشمی بال آج بھی اس کے ماتھے پر بکھرتے جا رہے تھے۔ تازہ شیو' پاؤں میں پشاوری چپل......

تینوں ایک ہی تکون میں کھڑے خاموش تھے' معاً نغمہ مڑی اور کھڑکی سے باہر جانے لگی۔ پیچھے سے نکل کر اس کو پکارتی شاہ گل بھی رک کر دیکھ رہی تھیں لیکن انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیٹی جو واپس جا رہی تھی' اب پھر سے گھر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ تاریک تھا۔

☆☆☆

"موور جانے! مور جانے! باہر روزہ (باہر نکلو)......دیکھو کون آیا ہے......" فاطمہ ان دونوں سے مل کر اب دوائیاں لینے کے بعد سونے کی کوشش کرتی مور جانے کے کمرے میں آکر جوش سے چلا رہی تھی۔ انہوں نے پہلے حیرت و مستفسرانہ نظروں سے دیکھا اور پھر فاطمہ کے چہرے پر اپنا جواب پا کر فوراً اتر کر چپل پہننے کے لیے دیکھنے لگیں لیکن جلدی میں ان کو چپل نہیں مل رہی تھی......انہیں خواب لگ رہا تھا' اس سے پہلے کہ ان کا خواب ٹوٹ جاتا' وہ ننگے پیر باہر نکلی تھیں اور انہوں نے دیکھا۔ صحن میں بہار کی روشن دھوپ پڑ رہی تھی اور چارپائی پر بیٹھے رستم خان کے قدموں میں ان کا وہ بچہ بیٹھا تھا' جس کے لیے وہ ہر وقت رویا کرتی تھیں......اس کے پیچھے ایک لڑکی کھڑی تھی' جس کا چہرہ سورج کی روشنیوں میں چمکتا جا رہا تھا۔ معاً اس لڑکی نے مور جانہ کو دیکھا اور مسکرائی......

"مجھے معاف کر دیں داجی!" وہ معافی مانگ رہا تھا اور سر جھکائے داجی کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ معافی تو وہ بھی مانگنا چاہتے تھے۔ جتنی نفرت انہوں زرک کو اس کے گناہ سے روکنے کے لیے کی' وہ اگر اس کو محبت سے سمجھاتے تو آج وہ ان کے قدموں میں یوں نہ بیٹھا ہوتا۔

سچ کہتے ہیں' معافی مانگنے کی ہمت ہر کسی میں نہیں ہوتی اور ان میں بھی نہیں تھی۔ رستم خان نے اس کے جھکے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور اسی وقت برآمدے میں کھڑی مور جانہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

☆☆☆

من تو شدم

(میں تو بن گیا ہوں)

اسٹوڈیو کی محرابی کھڑکیاں کھلی ہیں اور اس بار بہار کا پہلا سفید پھول کھل چکا ہے۔ سورج کی چمکتی روشنی اس کے فراخ و روشن ماتھے پر پسینے پر پڑتی ایسی معلوم ہوتی' جیسے کسی جوہری نے اپنے سارے موتی اس کے ماتھے پر سجا دیے تھے۔ تازہ گارے کی خوشبو اس کے پسینے کی خوشبو سے ملتی سرگراں تھی۔

تو من شدی

(اور میں تم بن گیا)

اس کا اسٹوڈیو نغمہ کے مجسموں سے خالی تھا۔ ماضی کی یاد کی طرح وہ اس کے حافظے سے ابھی تک لپٹی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو تازہ گارے سے اٹے تھے۔ لاشعوری طور پر اس نے ہاتھ کی پشت سے ماتھا صاف کرنا چاہا اور شہادت کی انگلی سے مٹی اس کے ماتھے پر ثبت ہو گئی......

من تن شدم

(میں جسم بن گیا ہوں)

تو جان شدی

(اور تو روح بن گیا)

اسٹوڈیو کے بیچ' گھومتے ہوئے چاک پر مٹی کو اس کے ہاتھ کوئی نئی شکل دے رہے تھے۔ اسی وقت تاجدار سورج کی چمکتی روشنیوں کے ساتھ وہ سادہ سفید جارجٹ کے کپڑے پہنے لڑکی کھڑی ہوئی اور مسکرائی اس بے خبر سفال گر کے قریب آئی۔ گھومتے چاک پر مٹی کے گرد اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

زرک نے ان ہاتھوں کو دیکھا' جنہوں نے اس کی مٹی کو "صنم تراش" سے "سفال گر" میں ڈالا تھا......

زرک نے مڑ کر دیکھا......اور دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا......!

اس گیلے گارے کی خوشبو پر' محبت کی خوشبو قابض ہونے لگی......!!!

تا کس نہ گوید بعد ازیں

(تاکہ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے)

من دیگرم

(کہ میں کوئی اور ہوں)

تو دیگری

(اور تو کوئی اور......)

☆☆

digest Novels Lovers group
urdunovels.com